ہنگامہ خیز خطّہ

شنوشب بجز معہ

میرا روزنامچہ

ہمرکابت شاھے

ڈاکٹر غلام حید میاں

بدریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت برکنار است
سعدیؒ

ہنگامۂ خیبر خطہ

میرا روزنامچہ

ہمرکابِ شاہی اعلیحضرت امیر امان اللہ خان غازی
والئے افغانستان

مصنف و ناشر

ڈاکٹر غلام حیدر (میاں) ایم۔ بی۔ ایس
پی۔ ایچ۔ ایس
(سول سرجن و ڈی ایچ او) ریٹائرڈ
سابق پولیس سرجن دہلی و سرجن رائل افغان میڈیکل سروس

ملنے کا پتہ
221 سرور روڈ۔ لاہور چھاؤنی پاکستان

مطبوعہ: اردو بازار۔ لاہور

مختصر تعارف مصنّف

ڈاکٹر غلام حیدر مرحوم بٹالہ مشرقی پنجاب میں ۲۱ رجون ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۹ء تک افغان میڈیکل سروس میں رہے۔ وہاں اپنی پیشہ وارانہ مہارت اور اعلیٰ کارکردگی پر شاہ افغانستان سے انعامات بھی حاصل کیے۔ بچہ سقاؤ کے خلاف جنگ میں بحیثیت کرنل ڈاکٹر ہمرکاب اعلیٰ حضرت کے عہدہ پر خدمات انجام دیں۔ جون ۱۹۳۰ء میں ریاست دوجانہ کی سروس کے بعد پنجاب میڈیکل سروس میں آگئے۔

اگست ۱۹۴۷ء دھرمسالہ پنجاب سے بحیثیت سول سرجن میانوالی تبادلہ ہوا۔ جون ۱۹۵۲ء میں ریٹائر ہوگئے۔ ۲۴ جون ۱۹۸۳ء (ماہ رمضان) میں وفات پائی۔ اور لاہور میں دفن ہوئے۔

اس روزنامچہ کو حکومت انگلشیہ انڈیا نے سیاسی وجوہ کی بنا پر چھاپنے کی اجازت نہ دی۔ اب حکومت پاکستان کی اجازت سے شائقین تاریخ کے لیے پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر غلام حیدر میاں

تعداد

طبع اول: ...... ۱۹۶۵ء [illegible]

طبع ثانی: ۱۹۸۹ء ۱۰۰

انتساب

اپنی بیوی کے نام جو پردیس میں سفری صعوبتوں سے بے نیاز میری خوشی اور غمی میں شریک حال رہی.....

Rs 16/=

تمہید

مورخہ ۱۹ر جون ۱۹۲۹ء کے دن جب روز ماہ محرم کی دسویں تھی ۔ میں نے افغانستان
ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا ۔ اور اپنے وطن عزیز ہندمیں واپس لوٹ آیا ۔ یہاں پر دیکھا ۔ کہ عوام کی
ریں ابھی تک افغانستان کی انقلابی اسٹیج پر جمی ہوئی تھیں ۔ ہر شخص انقلاب افغانستان کے صحیح
قعات سے آگاہ ہونے کا شوقین تھا ۔ اخبارات اس کے متعلق مزاحیہ اور طلسمیر قیاسی اور حقیقی
لومات قلمبند کر رہے تھے ۔ میرے بعض احباب نے مجھ پر زور دیا کہ میں اپنے چشم دیدہ حالات اس
متعلق پیپر پر قلم کردوں ۔ چنانچہ میں نے کچھ اپنے حافظہ پر زور دے کر اور کچھ اپنی مختصر سی ڈائری سے
م لے کر اپنے احباب کی فرمائش اور شوق کو پورا کرنے کی ٹھانی ۔ لیکن بعض حالات کی وجہ سے میں
ں کو عوام کے روبرو لانے میں قاصر رہا ۔ اب ایک عرصہ دراز کے بعد اس کمی کو پورا کر
ا ہوں ۔ اور اب اس کی اہمیت ایک یادداشتی رہ گئی ہے ۔ اور ہو سکتا ہے ۔ تاریخی جسم ہو
۱۹۲۱ء میں میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس کی ڈگری حاصل کی ۔
ین پنجاب میں سرکاری ملازمت کا راستہ مسدود دیکھا ۔ خوش قسمتی سے خلاف توقع مجھے کابل
ں افغانی ملازمت مل گئی ۔ اور میں ۱۰ر فروری ۱۹۲۳ء کے دن کابل پہنچ چکا تھا ۔ وزارت معارف
(وزارت تعلیم) میں مجھے کام سپرد ہوا ۔ یہ وہ زمانہ تھا ۔ جبکہ نوجوان سردار حیات اللہ خان وزیر
معارف کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے ۔ آپ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان کے سوتیلے بڑے بھائی
تھے ۔ اور ایک بے نظیر شخصیت کے مالک تھے ۔ اور ہمہ صفت شاہزادہ تھے ۔ بظاہر بھی بھولے
بھالے نظر آتے تھے ۔ اگرچہ عمر میں اس وقت تیس سال کے پھیر میں ہوں گے ۔ شفقت کا یہ عالم تھا
جب آپ کو علم ہوا ۔ کہ میں اپنی شادی کے دس یوم بعد ہی کابل آگیا ہوں ۔ تو مجھے خاص رخصت دے کر

ہند بھیجا۔ کہ میں اپنی بیوی کو کابل لے آؤں بہانہ ہند سے ادویہ خرید نے کا تھا۔

کابل میں سردار زمان الدین خان اس زمانہ میں والئے کابل تھے۔ آپ کو میرے سلاج سے کچھ فائدہ پہنچا تھا۔ اپنی تبدیلی پر مجھے بھی اپنے ساتھ صوبہ ہرات میں لے گئے۔ جہاں پر آپ نے نائب الحکومہ ہرات کا عہدہ سنبھالا۔ ہرات میں میں نے ۲۰ را کتوبر ۱۹۲۸ء تک ڈاکٹر ملکی (سول سرجن) کے فرائض بڑی محنت اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ اور صلہ میں مجھے حکومت افغانستان نے انعامات نقدی سے نوازا اور سرفراز کیا۔

مدیر طبیہ (میڈیکل ڈائریکٹر) اس زمانہ میں اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان کے چھوٹے سوتیلے بھائی سردار محمد کبیر جان تھے اور اچھے سرپرست تھے ۱۹۲۸ء میں میری خواہش پر مدیر طبیہ نے مجھے صوبہ قندھار میں تبدیل کر دیا۔ موٹر کار کے چار روزہ سفر کے بعد میں ۴ر نومبر ۱۹۲۸ء کے دن قندھار پہنچ گیا۔ میری خواہش تھی کہ اپنے وطن ہند سے قریب ہو جاؤں۔ یہاں پہنچا تو ایک عرصہ قلیل کے بعد ہی کابل سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ بچہ سقاؤ کی بغاوت کا چرچا ہوتا۔ جو بعد میں امیر حبیب اللہ کے نام سے چند ماہ کے لئے تخت کابل پر بیٹھ گیا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں برٹش راج تھا۔ اور ہندوستانی ہر جگہ بیرون ملک اور درون ملک محکوم تھا۔ چنانچہ افغان بھی اسے چنداں عزت کی نظر سے نہ دیکھتے۔ میری عزت بھی صرف میرے پیشہ کی وجہ سے تھی۔ فروری ۱۹۲۳ء میں پہلی بار کابل جاتے وقت مجھے رات جلال آباد میں گزارنی پڑی۔ کیونکہ پشاور سے ہم دیر سے چلے تھے۔ اور رجمود لنڈی کوتل اور ڈھکہ میں راہداری دکھانی تھی۔ اتفاق سے مقام ڈھکہ سے جلال آباد کے حاکم: علاء عبدالکریم خان کا ایک منشی ہمارا مفت ہم سفر بن گیا۔ کار میں پشاور سے صرف دو سوار آرہے تھے میرے علاوہ دوسرا سوار میرا ہم جماعت ڈاکٹر محمد یوسف چھوٹی تھا۔ جو میرے ساتھ عازم کابل تھا۔ ہم جلال آباد دیر سے پہنچے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ منشی صاحب نے از راہِ کرم ہم کو اجنبی اور ولایتی سمجھ کر ہماری شب باشی کا انتظام اس طرح کیا۔ کہ اپنے ایک چپڑاسی سے کمرہ خالی کروالیا۔ اس

میں مَیں اور ڈاکٹر محمد یوسف ٹھہر گئے۔ کمرہ کے کچے فرش پر درمیان میں آگ جلا دی۔ جس کو کڑاکے کی سردی میں ہم نے بڑا غنیمت جانا۔ ہم نے خود اپنے بستر ے کھولے اور ان کو ننگے فرش پر بچھا دیئے کپڑے بدلے اور بغیر کھائے پئیے اللہ کا شکر کر کے سو گئے۔ صبح ہوئی تو برفانی ٹھنڈا پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور ناشتہ کا سوچنے لگے۔

خدا بھلا کرے ڈاکٹر عبدالعزیز خان گجراتی کا۔ آپ نے جب سنا۔ کہ دو نوجوان ہندوستانی ڈاکٹر بےخبر جلال آباد میں گزشتہ شب پہنچے ہیں۔ تو آپ ہماری تلاش میں نکل آئے تھے۔ اور ادھر ہم ناشتہ کی فکر میں کمرہ میں بیٹھے پریشان تھے۔ آپ ہمارے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے ہم کو اس ادنیٰ ماحول میں دیکھا۔ تو بہت جلے۔ فوراً ہم کو اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے آئے۔ اور ہم کو نہایت عمدہ اور لذیذ اور وافر ناشتہ سے محظوظ کیا۔ اس وقت ڈاکٹر عبدالعزیز خان عمر میں پچاس پچپن سال کے چکر میں ہوں گے۔ بہت جہاندیدہ اور زندگی کے اونچ نیچ سے خوب آشنا نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ آپ افغانستان میں ایک مدت گزار چکے تھے۔ اور افغانی معاشرہ اور ان کے طریقہ کار اور فکر اور عمل سے کما حقہٗ آگاہ تھے۔ اس وقت جلال آباد میں کابل سے علیا حضرت والدہ محترمہ اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کے ہمراہ موسم سرما کی شدت گزارنے آئے ہوئے تھے۔ آپ علیا حضرت کے طبیب خاص بھی تھے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز خان کے لذیذ طعام اور آؤ بھگت نے جہاں ہم کو گرمایا۔ وہاں ان کی رازونیاز کی باتوں نے تو ہمارے حوصلے ہی پست کر کے رکھ دیئے۔ اب ہم پشیمان تھے کہ کیوں ایسے بے سوچے سمجھے دیوانے اور پرُخطر ملک میں آپہنچے تھے۔ پشاور سے چل کر لنڈی خانہ تک تو ہمارے حوصلے بلندی پر تھے۔ لیکن لنڈی خانہ اور تورخم چھوڑ کر جب ہم افغانی سرحد میں داخل ہوئے۔ تو بلندی پستی میں تبدیل ہونے لگی۔ اب ہماری کار بجری پر سے گزر رہی تھی۔ سڑک کیا تھی۔ ایک خشک پہاڑی نالہ معلوم دیتا تھا۔ اور جب ڈھکہ پہنچے تو بلندی ختم ہو چکی تھی۔ پستی انتہا پر تھی۔ ڈھکہ ایک افغانی سرحدی چوکی تھی۔ جہاں پرانی سرحد دار رہتا تھا۔ جو کسٹم افسر بھی تھا۔ اور اس جگہ ہماری دیکھ

جاتی تھی ۔ اور آتا جاتا مال چیک کیا جاتا تھا۔ سرحددار کے لئے ایک اکیلی چھوٹی سی اور مختصر پختہ عمارت بنی ہوئی تھی ۔ اس کے باہر میں نے چند ایک مال سے لدے ہوئے اونٹ دیکھے ۔ اس کے سوا اور کوئی مکان دیکھنے میں نہ آیا ۔ نہ ہی سڑک کے قریب اور نہ ہی دور ۔ ایک طرف لب سڑک میں نے ایک تنور دیکھا جس کے گرد دو تین پٹھان بیٹھے چائے پی رہے تھے ۔ اس کو ہوٹل کہہ لو یا قہوہ خانہ ۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی آبادی یا آرام گاہ نظر نہ پڑی ۔ تھوڑی دور کچھ اونچائی پہ ایک بلند دیوار دیکھی جو شاید کوئی پرانا قلعہ تھا ۔ یا محض چار دیواری ۔

پس منظر والی اس فضا میں ڈاکٹر عبدالعزیز خان کی باتوں نے بالکل کمر ہی توڑ ڈالی ۔ ہم ایسے ڈرے کہ بعد میں کابل میں انگریزی سفارت خانہ کا نام لینے سے ڈرتے تھے ۔ اور کابل کے بازار میں اگر کوئی برٹش سفارت خانہ کا ہندوستانی شکل و صورت کا انسان نظر آجاتا ۔ تو ہمارے حواس ہی تو اڑ جاتے ۔ اگر ہم وہ راستہ نہ چھوڑ سکتے ۔ تو کم از کم دیکھا ان دیکھا کر کے جلدی میں گزر جاتے ۔ ڈاکٹر عبدالعزیز خان نے ہم کو بتلایا کہ انگریزی سفارت خانہ میں آنا جانا موت کو دعوت دینا تھا ۔ بتایا کہ مصیبت کے وقت انگریز کبھی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا ۔ تم نے اپنی حفاظت یہاں پر خود کرنا ہے ۔ حکومت افغانستان کو کبھی موقع نہیں دینا ۔ کہ وہ ہم کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھے ۔ اور انگریز کا جاسوس گردانے ۔ بات درست معلوم دیتی تھی ۔ ہم محکومیت کی کمزوری کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے ۔ ایک اندیشہ یہ بھی تھا ۔ کہ ہم افغانستان میں افغانی پاسپورٹ پر آئے تھے ۔ یہ ہم کو پشاور میں افغانی وکیل التجار نے بنا دیا تھا ۔ انگریزی ہند سے ایک ہندوستانی برٹش سبجکٹ کو انگریزی دفتر سے افغانستان جیسے ملک کے لئے راہداری کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا ۔ کچھ لاعلمی کی وجہ سے اور کچھ ایک دشوار اور طویل دفتری طریقہ کار کی وجہ سے ۔

۱۹۱۹ء کی رولٹ ایکٹ والی شورش میں جو ہندوستانی مسلمان اپنا آبائی وطن ہندوستان ترک کر کے افغانستان میں ہجرت کر آئے تھے ۔ ان میں سے بیسیوں انگریز کے جاسوس گردانے گئے ۔

اور قید و بند کی اندھیری کوٹھڑیوں میں کس مپرسی کی حالت میں ختم ہو گئے۔ ڈاکٹر شہید عبدالعزیز خان نے پھر ہم کو ڈاکٹر
عبدالغنی اور محمد حسین خان جالندھری کی قید کا قصہ سنایا۔ جن کو امیر شہید حبیب اللہ خان کے زمانہ میں
قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ اور جو بعد میں امیر امان اللہ خان کے عہدِ حکومت میں رہا کئے گئے۔

مزید بھی میرے جیسے ناتجربہ کار، اجنبی کا موسم زمستان میں کابل کی طرف اکیلا سفر پر نکل آنا خود
کشی کے مترادف تھا۔ مگر خالق کائنات اور مسبب الاسباب حقیقی کی شفقت ملاحظہ ہو۔ جب وہ قلب
پاک اسباب معاش بناتی ہے۔ اور روزی کی راہ دکھاتی ہے۔ تو نگہبانی بھی پوری کرتی ہے۔ اُسی
ذاتِ قادر نے میرے تانگہ کے سفر کو کار کے سفر میں بدل دیا۔ (کار میں سفر اور پھر زمستان میں یہ ایک
نادر عمل تھا۔) اور پرفضائی ٹرک پر مہینوں کا دکھ دیا اور جان لیوا سفر گھنٹوں میں طے کر دیا۔ میرے بے
تکلف دوست ڈاکٹر محمد یوسف کا ساتھ پشاور سے مہیا کر دیا۔ جہاں جلال آباد میں ڈاکٹر عبدالعزیز خان
مہربان مل گیا تھا۔ وہاں کابل میں ڈاکٹر رشید الدین خان جان کا رکھوالا ثابت ہوا۔ قصہ مختصر یہ
ہوا۔ جلال آباد میں ڈاکٹر عبدالعزیز خان نے رخصت ہوتے وقت مجھے سمجھا دیا تھا۔ کہ کابل میں اس کے
مکان میں ٹھہر جاؤں۔ اُس کا ملازم ابھی وہیں تھا۔ رباط جگ دلق سے چل کر شام کے قریب جب یہ
کابل میں راستہ کی سردی کھلی چھت کی کار میں کھاتے پہنچا۔ تو وہ دن اللہ کے فضل سے برف و باری کے
ناغہ کا تھا۔ اور اُسی کے فضل کی برکت تھی۔ کہ کابل کے تمام راہ میں ناغہ ہی رہا تھا۔ اگرچہ کابل میں اور
ٹرک پر ادھر اُدھر جہاں نظر پہنچتی تھی۔ برف ہی برف دکھائی دیتی تھی۔ بڑی مشکل سے کرایہ کے تانگہ میں
بیٹھا۔ اور ڈاکٹر عبدالعزیز خان کا مکان میں نے تلاش کر لیا۔

کمرہ کیا تھا۔ فریج تھا ایک یخدان تھا۔ گویا دیواریں اور فرش یخ سے بنے ہوئے تھے۔ ملازم نے
کوئلہ کے لئے پیسے لئے اور باہر نکل گیا۔ میں نے ایک ننگی چارپائی پر بستر لگایا۔ اور بغیر مزید سوچے کچھ اس
میں لرزتا ہوا سو گیا۔ مجھے اتنا علم ہے کہ ایک فرشتہ ڈاکٹر سید رشید الدین خان آیا۔ اور مجھے جگا کر اپنے ساتھ اپنے
کرایہ کے گرم کمرہ میں لے گیا۔ بے چارہ ابھی وہ خود بھی سرائے کے ایک کمرہ میں قیام پذیر تھا۔ جو میرے خیرخواہ ہوا

کی دعاؤں کا اثر تھا۔ اور اس میں مزدور میری نیک نسیتۂ حیات کا اہم حصّہ تھا۔

دوپہر کا کھانا چُنا گیا۔ بہترین قسم کا کھانا تھا۔ لیکن اسے کھاتا کون۔ حقیقت یہ تھی۔ کہ میری بھوک جواب دے چکی تھی۔ میرا دماغ گھر کے خیالات میں اُلجھ چکا تھا۔ غنیمت یہ ہُوا۔ کہ اسی روز دوپہر کو کابل جانے کا میرا انتظام ہوگیا۔ ڈرائیور مالک کریم بخش پشاوری اپنی کرایہ کی کار لے آیا۔ جس میں گزشتہ رات ہم جلال آباد پہنچے تھے۔ وہ اب خلافِ امید اپنے نجی کام سے جلدی فارغ ہو چکا تھا۔ اسے یہاں اپنا کام بھی تھا۔ وہ چند جوڑے زری جوتوں کے اپنے ساتھ پشاور سے لایا تھا۔ جو شاید اس نے سوغات کسی کو دینے تھے۔ چنانچہ دوپہر کے وقت ہم کابل کی جانب چل پڑے۔ میرا ساتھی ڈاکٹر محمد یوسف جلال آباد میں خلافِ توقع تھوڑے دنوں کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ اس نے وزیر اعظیمہ سے ملنا تھا۔ جو اُس وقت لغمان میں تھا۔

ایسے حالات کے ماتحت میں جگر وگردہ کہاں سے لاتا۔ کہ ایک نجی ڈائری رکھتا۔ اور کسی وقت جاسوس کہلاتا۔ البتہ انقلاب ۱۹۲۹ء کے موسم بہار میں جب میں قندھار سے بطورِ ڈاکٹر ہمرکاب اعلیٰحضرت امیر امان اللہ خاں افغان لشکر میں شامل ہوگیا۔ تو معاً مجھے خیال آیا۔ کہ اگر خدانخواستہ میں دوران جنگی مہم ہلاک ہوگیا یا مرگیا۔ تو میرے وارثوں کو کم از کم جو ہندوستان میں تھے۔ ٹھیک علم ہونا چاہئیے۔ کہ میری موت کب؟ کیونکر اور کس جگہ ہوئی؟ اس کے لئے صرف میری ڈائری ہی صحیح طور پر کام دے سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس امر کو اپنے خیال میں دلیل بنا کر اور دل کڑا کر کے ایک ڈائری میں چیدہ چیدہ الفاظ روزانہ لکھنے شروع کر دیئے۔ اور یہی مختصر سی ڈائری میرے ساتھ ہندوستان میں آگئی اور اب کام آئی۔

پیشتر اس کے کہ میں اصل بات کو چھیڑوں، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اعلیٰحضرت غازی کے ابتدائی دَور کے کچھ حالات سے قارئین کرام کو آگاہ کردوں۔

نیز ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان والے موسم سرما میں مجھے ڈاکٹر عبدالعزیز گجراتی

اور ڈاکٹر احمد علی کنڈنگ مشیر ہوشیار پوری کی معیت میں سردار نادر خان فاتح تھل کے علاج کا موقع بھی ملا۔ سردار صاحب اس زمانہ میں وزیر حربیہ تھے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی نظروں میں گر چکے تھے۔ سردار صاحب تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ تپ دق کے مرض سے بھی خالی نہ تھے۔ اور اس کا علم خود ان کو بھی تھا۔ جب آپ تپ محرقہ سے بہ صحت ہو رہے تھے۔ تو آپ کو چھاتی سے خون بھی آیا تھا۔ شفایاب ہونے پر سردار صاحب کو بہ سفارت پر فرانس بھیج دیا گیا۔ سردار صاحب کا چھوٹا بھائی سردار شاہ ولی خان اعلیٰ حضرت کا سگا بہنوئی تھا۔ اور اس کے ساتھ بھی شاہ کا سلوک اچھا نہ تھا۔ اس زمانہ میں سردار صاحب کے بھانجے سردار داؤد جان اور سردار نعیم جان جو امیر شہید حبیب اللہ خان کے بیٹے تھے۔ ابھی کم سن بچے تھے۔ غالباً اعلیٰ حضرت سردار نادر خان کے خاندان کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اور چاہتا نہ تھا کہ یہ خاندان اور زیادہ ابھرے اور رسوخ حاصل کرے۔ اور پھر خطرناک بن جائے۔ یہ خاندان بڑی شستہ اردو بولتا اور ہندوستانی شرفا ان سے مل کر خوش ہوتے۔ سننے میں آیا تھا۔ کہ تینوں بھائی سردار نادر خان ہاشم خان اور شاہ ولی خان مقام ڈیرہ دون ہند میں بڑے ہوئے۔ اور وہیں انہوں نے تعلیم پائی۔ سردار نادر خان اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان کے ملک چھوڑ جانے پر امیر حبیب اللہ خان سے جنگ آزما ہوا۔ اور تخت کابل پر قابض ہو گیا۔

ڈاکٹر غلام حیدر

مدرس سابق ودکتور ملکیٔ افغانستان

و دکتور ہمرکاب ہمایونی اعلیٰ حضرت ہمایون

امیر امان اللہ خان غازی

امیر امان اللہ خان کی حکومت کا ابتدائی زمانہ

غالباً ۱۹۱۸ء کے آخر میں یا ۱۹۱۹ء کی ابتدا میں امان اللہ خان نے کابل میں ملک افغانستان کا تخت حاصل کیا۔ امیر حبیب اللہ خاں کے نمایاں بیٹے سردار عنایت اللہ خان، سردار حیات اللہ خان اور سردار امان اللہ خان تھے۔ ان سے چھوٹے سردار کبیر جان اور ان سے چھوٹے سردار داؤد جان تھے۔ سردار داؤد جان سردار نادر خان کا بھانجا تھا اور عمر میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔ سردار عنایت اللہ خان کے ننھیال کوہستان (کوہ دامن) میں اور سردار امان اللہ خان کے ننھیال خود کابل شہر میں تھے۔ اور پایہ تخت میں بارسوخ اور با اقتدار تھے۔ نامزد ولیعہد سردار عنایت اللہ خان تھا۔ امیر حبیب اللہ خان جلال آباد میں اندرونی سازش کے تحت شہید ہوا۔ غالباً اس سازش کا مقصد سردار عنایت اللہ خان کو محروم کرنا اور سردار امان اللہ خان کو تخت پر بٹھانا تھا۔ امیر حبیب اللہ خان کے بعد اسکا چھوٹا بھائی سردار نصر اللہ خان تخت پر بیٹھا۔ لیکن جلد ہی تخت کابل بغیر جنگ وجدل کے سردار امان اللہ خان کے قبضے میں چلا گیا۔

اب امیر امان اللہ خان نے اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے لیے دو چالیں چلیں۔ اول اس نے مذہب کی آڑ لی چنانچہ ابتداء میں علاوہ اور کاموں کے جمعہ کے روز مسجد میں جاتا اور امامت کرتا ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت طبعاً مذہبی رجحان رکھتا ہو۔ دوم۔ افغان باشندوں کو ان کے میلان طبع کے مطابق جہاد کی طرف راغب کیا۔ تاکہ ان کے خیالات ملک کے اندرونی معاملات سے کچھ عرصہ کے لیے ہٹ جائیں۔ چنانچہ باوجود بے سروسامانی اور ناتجربہ کاری کے اور وزرائے دولت کے مشورہ کے خلاف عنان حکومت سنبھالتے ہی اس نے ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں انڈو افغان وار کی طرح ڈالی۔ اور ایک زبردست انگریزی دولت سے ٹکر لے لی۔ حالات سازگار بنے۔ برٹش افواج بکھری پڑی تھیں اور پہلی جنگ عظیم سے تھکی ماندی تھیں۔ ادھر ہندوستان کے طول وعرض میں رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں عوام میں زبردست بغاوت نما ہیجان اور شورش برپا تھی بخت نے یاوری کی اور افغانستان نے برٹش اثر سے نکل کر دولت کا درجہ پایا۔ آزاد ہوتے ہی دولت افغانستان نے اپنے سفراء دوسری آزاد دول میں بھیج دیئے اور اپنے خارجی تعلقات مستحکم بنیاد پر استوار کر لیئے۔

اب ساتھ ہی اندرونی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ وزارتیں قائم کیں۔ تعلیم کو عام کیا۔
جہاں امیر حبیب اللہ خان کے زمانہ میں تمام ملک میں کابل کا صرف ایک مکتب تھا۔ وہاں اب
ہر صوبہ میں اور بعد میں ہر بڑے قریہ میں مکاتب کھول دیے۔ امان اللہ خان کی حکومت کے
آخری دور میں کوئی بڑا گاؤں ایسا نہ تھا جو اس نعمت سے ہمکنار نہ تھا۔ تعلیم مفت تھی اور لازمی
طالب علموں کو سارے ملک میں کتابیں اور دیگر سامان نوشت وخواند حکومت کی طرف سے مفت
اور بلامعاوضہ عطا ہوتا۔ کابل میں مکتب معلمین کی بنیاد رکھی۔ علاوہ اس کے لڑکیوں کی تعلیم
کیلئے مکتب زنانہ کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس کی سرپرستی کابل میں خود ملکہ ثریا فرماتیں۔ کابل میں
دارالتالیف وسیع پیمانہ پہ کام کرتا تھا۔ طلبہ کو مغرب میں تحصیل تعلیم ثانوی کے لیے تیار کیا۔
چنانچہ اس مقصد کے لیے کابل میں مکتب فرانسویہ اور مکتب المانیہ کھول دیئے ان میں
زبان فرانسویہ اور المانیہ کو ایسی ہی خصوصیت حاصل تھی جو ہندی مدارس میں زبان انگریزی
کو۔ انگریزی مکتب حبیبیہ میں پڑھائی جاتی تھی۔ معلمین ان مکاتب کے لیے مغرب سے منگوائے
گئے تھے۔ اس زمانہ میں سردار حیات اللہ خان وزیر معارف تھا۔ مجھے ان کے زیر سایہ کام کرنے
کا فخر حاصل تھا۔ مکاتب کے طلبہ اور مدرسین کو دوپہر کا کھانا حکومت کی طرف سے مفت ملتا۔ ذہین طلبہ
جدید علوم وفنون کی تحصیل کے لیے مغرب میں بھیجے جانے لگے۔ دفاتر کی جدید مغربی طرز پر تنظیم ہوئی۔ فرشی
دریوں اور ٹاٹوں کو جن پر بیٹھ کر مرزا لوگ کبھی کام کرتے، ختم ہو گیا اور کرسیوں اور میزوں کو جگہ ملی۔ سیاہ نویسی کا پرانا طرز تحریر
بھی ختم ہوا۔ اور اسکی جگہ جدید طریقہ کار جدول روبکار آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک قلیل عرصہ میں دفاتر کا کام مغربی طرز میں
ڈھل گیا تھا۔ ہر محکمہ کیلئے قوانین وضع ہوئے۔ ان کو مجلد کیا گیا اور اسکو نظام نامہ کے نام سے پکارا جاتا۔ اب
کوئی شعبہ اس کے اپنے ضابطہ سے خالی نہ تھا۔ محکمہ پولیس کے نقائص کی درستی ہوئی۔ کسیل غافر تعینی
تشدد کی جگہ استنباط (عدالتی جرح) کو ملی۔ نہ صرف یہ بلکہ نظام (آرمی) پیچھے نہ رہا۔ ہم بلحاظ لباس اور ہم بلحاظ
اسلحہ۔ نظام کا ہر فرد مغربی طرز کی ٹوپی پہنتا۔ ناموں کو وطنی بنایا گیا۔ صوبہ دار کو بلوک مشر کہہ کر بلایا جاتا تھا۔
کرنیل کو کنڈک مشر۔ کپتان کو ٹولی مشر۔ بریگیڈیر کو غنڈ مشر اور جرنیل کو فرقہ مشر کے نام دیے گئے وردیاں
اور ٹوپیاں وطنی ساخت کی مضبوط کپڑا سے تیار ہوئیں۔ پرانے فوجی افسروں کی جگہ جدید روشن خیال نوجوان
افسر دکھائی دیتے۔ کپڑے کی صنعت میں نمایاں ترقی اور اصلاح ہوئی۔ کابل کا مشین خانہ جہاں پہلے

صرف گولہ بارود بنتا تھا اب وہاں اونی کپڑا بھی بنا جانے لگا۔ تیار شدہ کپڑا ہندوستانی ملوں کے بنے کپڑے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ملازمین ملکی اور عسکری قانوناً اس کپڑے میں ملبوس ہوتے بغیر ملکی کپڑا کوئی نہ پہن سکتا تھا۔ کاشتکاروں کی رہبری اور حوصلہ افزائی کے لیے محکمہ زراعت کھولا گیا۔ سالانہ قلبہ رانی کا میلہ مدیریہ زراعت کی سرپرستی میں لگتا۔ دہقانوں کے مجمع میں خود گورنر صوبہ ہل چلاتا۔ اور فخر کرتا۔ کابل میں خود بادشاہ دہقانی لباس زیب تن کیے گاڈرانی کرتا۔ اب عمدہ اجناس پیدا کرنے والے انعام پاتے۔

خزانہ کے واصل و باقی کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ غبن کا امکان نہ رہا۔ قصہ کوتاہ کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس کی اصلاح نہ ہوئی ہو۔ اور اسے اچھے پیمانے پر نہ لایا گیا ہو۔ خود امیر امان اللہ خان کو پہلی بار میں نے ۱۹۲۳ء میں موسم بہار میں دیکھا۔ جبکہ وہ شہر کابل سے باہر کار میں اپنے مصاحبوں کے ساتھ عصر کے وقت چمن حضوری کی طرف غالباً سیر کی خاطر جا رہا تھا۔ میرے ساتھ میرے ہم جماعت سید رشید الدین امرتسری اور محمد یوسف چنیوٹی تھے اور ہم بھی اسی نیت سے باہر تفریح کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ جلدی میں دیکھا کوئی ۲۸ سالہ امیر امان اللہ خان نے وطنی ساخت کی چیل اور چارخانہ کپڑا سے بنا ہوا بند گلے کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر عام قسم کی سیاہ قراقلی ٹوپی تھی۔ دیسی کپڑا کی حوصلہ افزائی اس حد تک کی کہ جب کسی کے تن پر بدیسی کپڑا دیکھ لیتا وہیں قینچی سے کاٹ کر عیبی کر دیتا۔ اس مقصد کے لیے ایک نفیس قینچی ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا۔

اس زمانہ میں صرف مامورین دولت ہی لازمی طور پر کوٹ پتلون پہنتے۔ دفتر میں کوئی ملازم پگڑی باندھ کر نہ آسکتا تھا۔ جو پکڑا جاتا پچاس روپے جرمانہ ادا کرتا۔ دوپہر کو ایک گھنٹہ کی رخصت دفتروں میں ہوتی۔ اس وقفہ میں مامورین طعام تناول کرتے اور نماز ظہر باجماعت پڑھتے۔ نماز کے لیے بڑے کمرہ میں چاندنی بچھ جاتی۔ وزارت کے اہل کاروں کو دوپہر کا کھانا حکومت کی جانب سے بلا معاوضہ ملتا۔

امیر نے تخت پر جلوس کرتے ہی لونڈی اور غلام آزاد کر دیئے اور بردہ

فروشی کی مناہی کردی۔ اس سے پہلے علاقہ جات چترال اور ہزارہ کے لوگ کابل میں لونڈی اور غلام بنا کر لائے جاتے۔ میرے قیام کے زمانہ میں بھی ان علاقوں کے لوگ گھریلو کام کرتے۔ اگرچہ وہ اب آزاد تھے۔ میرے مکان کے مالک کے گھر اس کی موجودہ دوسری بیوی چترالی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک لونڈی تھی۔ میرے دوسرے ہمسایہ کے گھر ہزارہ ملازم پہلے غلام تھے۔ اب وہ شاکی تھا۔ ملازم لوگ اب کام سے گریز کرتے تھے۔ خود اپنے والد امیر شہید کی کنیزیں شاہ نے اپنے ہاتھ سے آزاد کیں۔ اور ان کو دوسرے نکاح کی اجازت تھی۔ محمد زئی کنبہ کے لوگ جن کے تمام ذاتی نقدی وظائف روک لیے۔ ان سے صاف کہہ دیا کہ خود کماؤ اور کھاؤ۔ حقیقتاً امیر امان اللہ خان جمہور پسند تھا۔ اپنے آپ کو عوام میں شمار کرتا۔ بھیس بدل بدل کر محکمہ جات کے نقائص سے آگاہی حاصل کرتا اور ان کو دور کرتا۔ یہ کہیں کہ وہ شیدائے ملت تھا بے جا نہ ہوگا۔ خدمت وطن کا اس کو جنون تھا۔ رات ہو یا دن وہ ملک کی ترقی و بہبودی کے لیے ہمہ تن مصروف رہتا۔ وہ ایسے راستہ پر چل رہا تھا جس کو دیکھ کر بعض اوقات یہ گمان ہوتا کہ وہ عنقریب شخصی حکومت کو خیرباد کہہ دے گا اور ایک جمہوری نظام قائم کر دے گا۔ کوئی جرگہ یا اجتماع نہ ہوتا جس میں لوگوں کو وہ بیدار نہ کرتا۔ کہ وہ نڈر ہو کر کیوں اپنے حقوق ماموریں دولت سے نہیں لیتے جبکہ آزادی ان کا پیدائشی حق ہے۔ کابل میں مجلس شورائے ملی قائم کی۔ صوبہ جات میں ایسی ہی مجالس گورنروں کی صدارت میں کام کرنے لگیں۔ ان مجالس کے ممبران اپنے اپنے علاقہ جات سے نامزد اور منتخب ہو کر آتے تھے۔ بعد میں ہر بڑے شہر کو ریاست بلدیہ دی گئی۔ تاکہ لوگ شہروں میں اپنا انتظام خود اپنے حسب منشا انجام دیں۔ یہ برکات خود شاہ کی عطا کردہ تھیں۔ لوگوں نے لڑ جھگڑ کر نہ حاصل کی تھیں اور ان کے لیے کوئی قربانی نہ دی تھی۔ حالانکہ مطلق العنان تخت کا وارث تھا اور اسی فضا میں وہ سریر آرا ہوا تھا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں آزادیٔ نسواں کی تحریک ابھی اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ گاہے گاہے اکا دکا عورت مکتبی سیاہ برقعہ میں مستور چمن حضوری کے قریب میں شام کی سیر میں مصروف دیکھی جاتی۔ ملکہ افغانستان کی سرپرستی میں یہ تحریک آہستہ آہستہ زور پکڑ رہی تھی۔ مستورات کو اپنی آزادی کا احساس دن بدن زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ مکتب کی طالبات آزاد ہونے والی تھیں۔ بعد میں آزادی کے ساتھ ساتھ اس کی لازمی خرابیاں بھی ساتھ ساتھ کھچی چلی آنے لگیں۔ جن کو عوام ابھی گوارا نہ کرتے اور برا مناتے۔ کابل میں لڑکیوں کی تعلیم بھی لازمی ہو گئی تھی۔ اور مفت تھی۔ تخت نشینی کے تھوڑا عرصہ بعد فوج میں بھرتی جبری طور پر ہونے لگی۔ ملک کا ہر فرد ہشت نفری کے قانون کے تحت دو سال کے لیے تعلیم نظامی (عسکری) حاصل کرتا۔ اور بطور سپاہی عسکر میں خدمت انجام دیتا۔ جو شخص بندوق نہ اٹھا سکتا وہ نظام کے کسی اور صیغہ میں کام کرتا۔ خدمت سے صرف وہی شخص معذور سمجھے جاتے جو یا تو اپنا عوض دیتے یا ایک ہزار روپیہ نقد تاوان یا معاوضہ خزانہ ملک میں داخل کرتے یا جن کو طبیب عسکری ناقابل قرار دیتا۔

ہر بڑے گاؤں میں ڈاکخانہ بنایا گیا۔ اب ملک کے گوشہ گوشہ میں خطوط پہنچنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی غالباً سنہ ۱۹۲۲ء میں افغانستان دنیا کے بین الملکی پوسٹل سروس کا رکن بن گیا۔ اس سے پہلے تار کا انتظام نہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں کابل سے پشاور تک تار جانے لگا۔ اس کے بعد انگریزی سرحد چمن سے قندھار کو بذریعہ تار مربوط کیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں روسیوں کی زیر نگرانی ہرات سے قندھار کی سمت تار کشی کا سلسلہ وجود میں آچکا تھا۔ لیکن انقلاب کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ادھورا ہی رہ گیا۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں صرف امراء ہی پشاور سے اکا دکا کرایہ کی موٹر میں کابل آتے۔ اس زمانہ میں میں نے خود ایک بار تانگہ میں کابل سے پشاور تک سفر کیا۔ موٹر کار ایک نادر سواری تھی سنہ ۱۹۲۳ء کے آخر میں قندھار سے بھی ہرات تک لاری چلنے لگی۔ اس سے پہلے لوگ اونٹ اور ٹٹو پر سفر کرتے۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے صرف قابلیت معیار تھی۔ تمام ملک میں جہاں صرف ایک ہی شفاخانہ ملکی کابل میں تھا۔ اب سنہ ۱۹۲۴ء کے بعد صوبوں کے صدر مقاموں پر بھی ایک ایک شفاخانہ ملکی کھل گیا جو کاملاً خیراتی تھا۔ سب کے لیے امیر ہو یا غریب۔ علاج کے لیے ڈاکٹر باہر سے منگوائے مشرق سے اور مغرب سے اور بڑی بڑی تنخواہوں پر۔

شہر کابل پرانی طرز پر بے قاعدہ بنا ہوا تھا۔ گلی کوچوں میں بدرویں نہ تھیں۔ صفائی کے نقطہ نظر سے شہر کی حالت تسلی بخش نہ تھی اس لیے بصرفہ زر کثیر جدید طرز پر نئے شہر دارالامان کی بنیاد ڈالی اگرچہ شہر جدید کا عمارتی سامان از قسم آہن اور سیمنٹ وغیرہ پشاور سے چھکڑوں پر لانا پڑتا۔ یہ چھکڑے اونچے اونچے دشوار گزار پہاڑی رستوں کی مسافت میں کئی کئی دن صرف کر دیتے۔ بلکہ دیکھنے والا سوچتا کہ افغانستان جیسے غریب ملک کے لیے کیا یہ اسراف نہیں ہے۔ یہ سلسلہ سنہ ۱۹۲۲ء میں ہی غالباً شروع ہو چکا تھا۔ شاید اس سبب سے کہ حکومت کا خزانہ اس بار کا پورے طور پر متحمل نہ تھا۔ یہ کام بڑی دھیمی رفتار میں جاری تھا۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں سمت جنوبی یعنی علاقہ خوست میں بعض جدید اصلاحات کی مخالفت میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے۔ جس میں ملائے لنگ نے خاص شہرت حاصل کی مفرور افغان شاہ کا بیٹا شہزادہ عبدالکریم خان ہند سے فرار ہو کر خاک افغانستان میں داخل ہوا اور افغان شورش سے اس نے ہاتھ رنگنے کی ٹھانی۔ بغاوت خاصے بڑے پیمانہ پر تھی۔ علاقہ خوست کی اقوام منگل اور جدران نے کابل کو لوٹ لیا ہوتا اور امیر کی حکومت کا تختہ اسی زمانہ میں ہی الٹ چکا ہوتا۔ اگر امیر کا معتوب بڑا بہنوئی سردار علی احمد جان باوجود اندرونی اختلاف اور دبی رنجش کے اس آڑے وقت میں کام نہ آتا۔ کہتے ہیں سردار علی احمد جان اس وقت خانہ نشین تھا۔ مگر اس کا اثر و رسوخ جلال آباد کے

کے علاقہ میں کافی دوانی تھا۔ یہاں اس نے کسی وقت میں دھڑلا دار حکومت کی تھی۔ امیر امان اللہ خان کا اشارہ پاتے ہی فوراً جلال آباد پہنچا۔ اس نے باغیوں کی پیش قدمی کو روک دیا۔ مرکزی حکومت کا پلہ بھاری کر دیا۔ میرے ایک دوست نے مجھے بتایا۔ کہ اس کا ساتھ غیر علاقہ کے قبائل نے بھی دیا۔ منصوب پھر مقبول ہوا۔ اور اس کو اس صلہ میں صوبہ کابل کی نائب گورنری ملی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ ۱۹۲۸ء کے انقلاب میں بھی سردار علی احمد جان کو ہی پھر ایک بار سمت مشرقی کی کمان سونپی گئی۔ ۱۹۲۴ء کی بغاوت میں حکومت کابل نے اعلان کیا تھا۔ کہ وہ اصلاحات جدید پر نظر ثانی کرے گی۔ بغاوت فرو ہوئی مگر اصلاحات پر نظر ثانی نہ ہوئی اور وہ جوں کی توں برقرار رہیں۔ اس وعدہ خلافی نے ۱۹۲۸ء کی بغاوت پر بڑا اثر ڈالا۔ اور اس بار مرکزی حکومت کے مواعید کو باور نہ کیا جاتا۔ انہیں منافقت کہا جاتا۔ کابل میں ۱۹۲۳ء میں اک بار میں نے ملکہ ثریا اور اس کی چھوٹی بہن بی بی خورد کو مغربی لباس میں ملبوس سر پر ہیٹ لگائے اور چہروں پہ ہلکی جالی ڈالے گھوڑوں پر سوار ارگ کی طرف گزرتے دیکھا۔ اس زمانہ میں اور کوئی عورت ایسے لباس میں باہر نہ نکلتی تھی۔ البتہ لمبے موزوں کا استعمال عام ہو چلا تھا۔ پنڈلیاں نظر آتی تھیں۔

سیاحتِ یورپ

اہالی افغانستان میں سیاحت کا شوق بڑھ رہا تھا۔ حکومت کی روایتی تنگ نظری باقی نہ تھی۔ پھر بھی ممالک خارجہ کی سیاحت کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تراشا جاتا۔ چنانچہ وزیر معارف شہزادہ حیات اللہ خان ۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں، ایک ایسے ہی حیلہ کی بنا پہ یورپ تشریف لے گیا۔ مجھے بمبئی تک اس کے ہمراہ جانا پڑا۔ کیونکہ اپنی بیوی کے علاج کی خاطر وہ یورپ جا رہا تھا۔ جب ہم افغانستان کی سرحد ڈکہ پہنچے تو اس کی اہلیہ کی انیف مرض جاتی رہی۔ جب ہم بمبئی میں تھے۔ تو بغیر علاج اہلیہ صاحبہ بالکل تندرست یورپ کے سفر کے لئے تیار ہم تیار کھڑی تھیں۔ البتہ یورپ کا سفر سردار حیات اللہ خان کے لئے مفید ثابت ہوا۔ واپسی پر جسم نہایت موزوں

تناسب میں آگیا تھا۔ فالتو چربی جسم میں نہ تھی۔ اور دیکھنے میں جوان تر معلوم دیتا تھا۔
امیر کے مصاحب اور سفرا اکثر ممالک غیر کے دلچسپ حالات امیر سے بیان کرتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ سردار عنایت اللہ خان نے بھی واپس کابل آکر چھوٹے بھائی کے شوق کو تیز کیا ہو۔ امیر کا شوق سیاحت دن بدن ترقی کرتا گیا۔ آخر ۱۹۲۸ء میں بادشاہ نے دوراندیش خدشات اور خطرات کو نظر انداز کیا۔ اور خیر خواہوں کے مشورہ کے خلاف سیاحت یورپ پر مُصر ہو گیا۔ اپنے معتمد وزیر خارجہ ولی محمد خان اُزبک کو اپنا قائم مقام ٹھیرایا۔ اور دول مغرب کی دعوت پر سیاحت یورپ پر کابل سے روانہ ہو گیا۔ میں اس وقت ہرات میں تھا۔ بادشاہ نے ظاہر کیا۔ کہ یہ سفر اس کو نئے معلومات بہم پہنچائے گا۔ اور واپسی پر وہ اپنے ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو گا۔ لیکن فطرتاً یہ سیاحت زمانہ بینی اور تفریح طبع کے لئے بھی مزید تھی۔

سُنا گیا۔ کہ کار میں بیٹھنے سے پہلے ملکہ ثریا اور شاہ کی چھوٹی بہن سراج البنات نے اپنے چہروں کو پہلی مرتبہ بالکل بے نقاب کیا۔ اس کا اثر اطراف ملک میں اچھا نہ پڑا۔ شاہ کی عدم موجودگی میں بادشاہ کے مخالفین کو لوگوں کو گمراہ اور مشتعل کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ ملک میں تنگ نظری کا مواد کافی تھا۔ مخالفین کی رنگینیٔ طبع نے فضا کو ہزار طریقوں سے مسموم کیا۔ کابل میں شہری طبقہ اخلاقی بے اعتدالیوں میں پیش پیش تھا۔ لڑکیاں آزاد ہو چکی تھیں۔ نوجوان ایسے افعال کے مرتکب ہوتے۔ جن کو اہل دہاتی دیہاتی اور قبائلی لوگ دیکھ کر گوارا نہ کرتے۔ ان بے اعتدالیوں کا ذکر میں نے خود ہرات میں ایک افسر اسٹنٹ مستوفیٔ ولایت ہرات مرزا خیر محمد خان کی زبانی سُنا۔ جو کابل میں رخصت گزار کر ۱۹۲۷ء میں واپس ہرات پہنچا تھا۔ وہ اپنے چشم دید حالات بیان کرتا۔ اور کہتا۔ کہ کابل اتنا دُور آگے نکل چکا ہے۔ کہ چند سال قبل اس کا تصور بھی اُن کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔ یہ افسر خود نوجوان تھا۔ اور اپنی دوسری شادی رچا کر آیا تھا۔ اور اب وزیر مالیہ کا داماد بنا تھا۔ کہتے کہ خدا جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر رُکے گا۔

علماء کی عزت باقی نہ تھی۔ جدید الخیال شہری طبقہ ان کی تحقیر کرتا۔ دیوبند ہند کے فارغ التحصیل عالم لوگ
حکومت کے اعلان کے مطابق مساجد میں امامت کی خدمات نہ سرانجام دے سکتے تھے۔ لہذا انہیں علماء نے
ملک کے اطراف واکناف میں زبردست مخالف پروپاگنڈا کیا۔ لوگوں کو بتایا کہ شاہ نصاریٰ کی تقلید
میں سب کچھ بھول چکا ہے۔ نماز نہیں پڑھتا۔ روزہ نہیں رکھتا۔ پردہ کے خلاف ہے۔ ملک میں بے حیائی
کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بیرونی اخبارات میں بادشاہ کے متعلق جو ذکر بار بار آتا۔ اسے توڑ مروڑ کر جاہل
عوام کے گوش گزار کیا جاتا۔ ملکہ کے بے نقاب عکس ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچائے گئے۔ اور ان سے
عجیب وغریب اخلاق سوز اور گمراہ کن قصے وابستہ کئے گئے۔ ایسا ہی ایک عکسی کارڈ قندھار میں
میں نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جس کو شاہ کے ایک مخالف نے پروپاگنڈا کی خاطر اپنی اندرونی
جیب میں چھپا رکھا تھا۔ یہ فوٹو جاہل اور سادہ لوح عوام کو بہکانے کے لئے کافی تھا۔ ملکہ کو برہنہ وہ تو
اپنے ملک میں دیکھ اور سن ہی چکے تھے۔ اس لئے ہر بیہودہ افواہ کا ان کو یقین آجاتا۔ ہندی سرحد کے
قریب میں رہنے والے لوگوں کے کانوں تک انگریزی علاقہ سے اخباری خبریں اور افواہیں پہنچ جاتیں۔
بغاوت کی ابتداء ہندی سرحد کے قریب سے ہوئی۔ ہو سکتا ہے۔ کچھ ایسی باتیں ہوں۔ جن کی وجہ سے افغانستان
کی برسر اقتدار حکومت انگریز کی نظر میں اچھی نہ ہو۔ حکومت ملک انگریزی اقتدار سے خائف ضرور رہے
گی۔ کیونکہ وہ انگریز کی قوت سے آگاہ تھی۔ لیکن ہر عوام انگریز کو برا نہ کہتے۔ البتہ عوام روس کو
اچھا نہ جانتے۔ اس کی وجہ اس ملک کی لادینی تھی۔ ملک دو انگلو و دولیو آئی کے درمیان پھنسا ہوا تھا
اور حکومت کو اپنی بقاء کے لئے سیاسی داؤ پیچ کا کھیل ضرور کھیلنا ہوتا۔ انگریز کی خواہش یہ رہی۔ کہ
حکومت افغانستان بے اعتنائی نہ برتے۔ اور تعاون کرے۔ اور اس کے لئے ایک خاص رقم بھی
وہ خرچ کرتا۔ بعض مامورین دولت شاید ایسے ہوں۔ جو بلاوجہ کوتاہ اندیشی برت کر ایک طاقتور
ہمسایہ کی ناراضگی مول لیتے ہوں۔ اور یہ ان کی اپنی ذاتی کم علمی اور کوتاہ بینی کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ ایک
ایسا مامور ۱۹۲۳ء میں مستوفی ولایات کابل میں تھا۔ شاید اس کا نام مجتبیٰ خان تھا۔ وہ شیخ

محبوب علی اورینٹل سیکرٹری سفارت خانہ انگریزی کو جوان توجہ کر انتظار میں بٹھا رکھتا۔ اور اس پر ناجائز فخر کرتا۔ دراصل وہ کریک ذہین تھا۔ یعنی خبطی الدخل، اور حقیقت میں زخم معدہ کے مرض میں مبتلا تھا۔ وہ اپنے ملک کو بھی اپنے زیر احسان سمجھتا۔ اس کو ناز تھا۔ کہ وہ راشی نہ تھا۔ اور اس نے ملک کے دفتری حساب کتاب کو درست کیا تھا۔ محمد حسین خان جالندھری اس کا بظاہر بہت مداح تھا اور اکثر شام اس کے پاس ہی گزارتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے محمد حسین خان کوہستانی مرحوم کی جگہ ملی تھی۔ محمد حسین خان کوہستانی مستوفی ولایات امیر شہید کے زمانہ میں ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ بود و باش اور دبدبہ میں بادشاہ وقت سے کچھ کم نہ تھا۔ اس کے بچے جواہرات میں کھیلتے تھے۔ اس کو ناز تھا کہ جنگجو علاقہ کوہستان اس کے ساتھ تھا۔ وہ سردار عنایت اللہ خان ولیعہد کا طرفدار تھا کیونکہ ولیعہد کا ننھیال علاقہ کوہستان (کوہ دامن) میں تھا۔ اس کی موت کا باعث امیر امان اللہ خان بنا۔ جب امیر امان اللہ خان نے تخت سنبھالا۔ محمد حسین خان مرحوم کی موت کے بعد اس کے بچے نان شبینہ کے محتاج ہو چکے تھے۔ اس کے ہونہار بیٹے کا وظیفہ اس کی تعلیم کے لئے حکومت نے بڑی مشکل سے منظور کیا تھا۔ محمد حسین خان کی سب جائیداد شاہ نے ضبط کر لی تھی۔ اور اس کا رنج اس کے علاقہ کے لوگوں کے دلوں میں موجود تھا۔ موجودہ مستوفی ولایات لباس اور بود و باش میں کثیف تھا۔ اور اس کی وجہ سے اس کے پاس بیٹھ کر طبیعت خوش نہ ہوتی۔ اس کی بیٹھک یعنی سراپہ ادنیٰ قسم کا تھا۔

یہ حقیقت چھپائی نہیں جا سکتی۔ کہ برٹش حکومت ہمیشہ سے مسلمانان عالم کی دشمن نمبر ایک بنی آئی ہے۔ انگریز نے مسلمان کو کہیں بھی آسودہ اور طاقتور گوارا نہیں کیا۔ وہ خوش اعتقاد مسلمان کا بدترین دشمن ثابت ہوا ہے۔ مسلمان کے کھنڈرات پر شاندار برٹش سلطنت نے جنم لیا۔ جس پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ مسلمان کے ملک کے وسائل اس کی خوشحالی کا موجب تھے۔ کس مسلمان ملک کے اس نے حصے بخرے نہیں کئے۔ اور کر والئے۔ وہ کون سا مسلمان ملک تھا۔ جس کے اندر انگریز نے ریشہ دوانیاں نہیں کیں۔ اور تخریب و انتشار پیدا نہیں کیا۔ اگر سیاستاً اس نے ترقی کی شاہراہ پر گامزن

افغانستان کو بھی تباہی سے دوچار کرایا۔ تو اس میں کونسی نئی بات تھی۔ اور بعید از قیاس کیونکر تھا۔

شاہ کی سیاحتِ یورپ سے واپسی

سیاحت یورپ سے واپسی پر امیر امان اللہ خان ایران کے راستہ پہلے ہرات میں وارد ہوا جس
اس وقت شہر ہرات میں مامور تھا۔ اور رسم استقبالیہ میں شامل بروز جمعۃ المبارک مورخہ ۱۴ جون ۱۹۲۸ء
مطابق اول برج سرطان ۱۳۰۷ کو آپ نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ خاک ہرات پر قدم رکھا۔ استقبال
مناسب ہوا۔ توپوں سے سلامی اتاری گئی۔ استقبال کو کامیاب بنانے کے لئے صوبہ ہرات کے گورنر
محمد ابراہیم خان نے جو شاہ کا ماموں بھی تھا۔ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ شاہ موٹر کار چھوڑ کر گھوڑے
پر سوار ہو چکا تھا۔ اور مامورین کی دو طرفہ قطار میں سے سڑک پر گزر رہا تھا۔ نائب الحکومہ پیادہ ساتھ
ہو گیا تھا۔ مامورین دولت کے پیچھے دو رویہ شہر کے لوگ خاموش کھڑے محوِ تماشہ آداب بجا لا رہے تھے۔
جائے استقبال شہر ہرات سے کوئی دو میل باہر مزار جامی کے قریب تھا۔ شاہ ذرا آگے بڑھ کر موٹر کار
پر دوبارہ سوار ہو گیا۔ اور اپنی جائے اقامت کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسپ سوار شاہ کے پیچھے موٹر کار
میں ملکہ ثریا آگے بیٹھی اسے خود چلا رہی تھی۔ چہرہ پر رسمی نقاب نہ تھا۔ ملکہ اس کے نصف نچلے حصہ پر
باریک اور نازک گلابی رنگ کا دوپٹہ ملکہ نے لے رکھا تھا۔ ہرات کا نائب الحکومہ راشی تھا۔ صوبہ کے
لوگ بھرے بیٹھے تھے۔ چاہتے تھے۔ کہ نائب کی بے اعتدالیوں سے شاہ کو آگاہ کریں۔ لیکن رسائی نہ
ہوئی۔ شاہ نے یہاں نہ تو کوئی دربار کیا۔ اور نہ ہی کسی کو شرفِ باریابی بخشا۔ نائب ناتجربہ کاری
میں غریب رعایا کا بہت سا روپیہ بیجا خرچ کر چکا تھا۔ جو کام شروع کئے تھے۔ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکے تھے
۱۹۲۸ء کے انقلاب میں جب ہرات میں سپاہ باغی ہوئی۔ تو ہندی کمپونڈر محمد دین امرتسری کے
بیان کے مطابق جو اس وقت ہرات میں موجود تھا۔ باغی سپاہی محمد ابراہیم خان کو اس کے گھر چہار
باغ سے پکڑ لائے۔ اور پایہ حصار کے چوراہا میں اسے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اور اس کی نعش کو

قلعہ کی خندق میں دھکیل دیا۔ اور ساتھ ہی اس کے دو داما دوں فرقہ مشر عبدالرحمٰن خان اور حاکم علاقہ غلام صدیق خان کو بھی موت کی نیند سُلادیا۔ اس علاقہ کے لوگ ہمیشہ سے ایسے موقعوں پر ایسے ہی بُزدلانہ اور ہولناک جرائم کے مرتکب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ویسے بھی ہراتی لوگ اپنے کابلی حاکموں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ یہاں پر حاکم اور محکوم کا سوال کارفرما تھا۔

ہرات میں شاہ دو شب صرف ٹھہرا۔ اُس کے قیام کے لئے کوئی شایانِ شان عمارت نہ تھی۔ نائب نے شاہ کو شفاخانہ کی نئی عمارت میں ٹھہرایا۔ اتفاق سے یہ کوٹھی نما چھوٹی سی جدید طرز کی عمارت شہرِ نو میں شفاخانہ کے لئے بنائی گئی تھی۔ اور ابھی مریضوں کے لئے استعمال میں نہ آئی تھی۔ ایک شام شاہ موٹر کار میں سوار زیرِ تعمیر شہرِ نو کی طرف سے شہرِ قدیم میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک کالسکہ کو جس میں کچھ خواتین برقعہ پوش سوار جا رہی تھیں۔ روک لیا اور کہا کہ اب چہروں پر سے نقاب دُور کر دو۔ اور اندھوں کی مانند دیکھنا چھوڑ دو۔ لوگ سمجھ گئے کہ ملک میں پردہ اب چند روز کا مہمان ہے۔ ملکہ سُنا گیا کہ ملکہ ثریا نے ہرات کے نائب الحکومہ محمد ابراہیم خان کی کوٹھی میں سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہ جان کے سر کے خوبصورت سنہری بال خود اپنے ہاتھ سے کاٹ کر چھوٹے کر دیئے۔ اس سے پہلے لڑکی کی چوٹی بنی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے ازیں بعد لڑکی کو بے چوٹی دیکھا۔

نئی اصلاحات

امیر کے کابل پہنچنے پر جلد ہی جلد ہی نئی اصلاحات احکامات کی شکل میں صوبہ جات میں پہنچنے لگیں ہشت نفری جبری بھرتی میں اب کوئی رورعایت باقی نہ رہی۔ نہ عوض لیا جاتا، اور نہ ہی روپیہ معاوضہ میں قبول کیا جاتا۔ سب کے لئے دو سال کی فوجی تربیت اور خدمت لازمی کر دی گئی۔ پھر مقامی پولیس کے لئے کانسٹیبل بھی شہری آبادی میں سے دو سال کی خدمت کے لئے نظامی بھرتی کے اصول پر جبراً بھرتی کئے جانے لگے۔ جبری بھرتی سے بچنے کے لئے کاروباری لوگ طرح طرح کے حیلے تراشتے۔ رشوت ستانی اور بڑھ گئی۔ امیدوار اور ان کے متعلقین دفتروں میں دھکے کھاتے پھرتے۔ ان دونوں خدمات کے لئے بھرتی

مسلمان رعایا ہی سے بھرتی کی جاتی ۔ یہودی اور دیگر غیر مسلم مثلاً ہندو لوگ فقط جزیہ دیتے ۔ صرف شہر
ہرات میں چوتھائی آبادی یہودیوں کی تھی ۔ ان میں سے سرکاری ملازم کوئی نہ تھا یہ اچھے کاروباری لوگ
تھے ۔ وسیع پیمانہ پر مال برآمد اور درآمد کرتے ۔ پھر حکم آیا کہ سب مامورین لازمی طور پر ہیٹ پہنیں ۔ ہرات
کا نائب الحکومہ محمد ابراہیم خان بالکل ایک سادہ قدیم وضع کا معمر شخص تھا ۔ کام کے وقت فرشی گدیلہ پر
بیٹھتا ۔ اس کی ڈاڑھی مشرع تھی ۔ شاہ کے ہرات سے چلے جانے کے فوری بعد اس نے اپنی وضع قطع بدلی
گدیلہ چھوڑ کرسی پر بیٹھنے لگا ۔ اب لمنہ امیز پر چُنی جاتی ۔ ڈاڑھی مشین سے چھوٹی خشخاشی وضع کی کر دی ۔ بڑی
مونچھیں قینچی سے صاف کرا دیں ۔ عمامہ کو رخصت دی ۔ اور ہیٹ کو جگہ بخشی ۔ تقلید میں دوسرے مامورین بھی
پیچھے نہ رہ سکتے تھے ۔ چنانچہ سب نے اسے اپنایا ۔

چند دنوں بعد حکم آیا ۔ کہ دفتروں میں ملکی ہوں یا نظامی آدھی تعداد ملازمین کی عورتیں رکھی جائیں ۔ خود
فرقہ مشر غوث محمد خاں کو میں نے اس حکم پر نکتہ چینی کرتے سُنا ۔ اس حکم کے تحت ہرات کے شفاخانہ میں ایک
ناخواندہ نرس رکھی گئی ۔ اور اُمیدواروں کی تلاش ہوئی ۔ پھر صرف ایک بیوی رکھنے کا حکم سُنایا گیا ۔ اس نئے حکم
پر بھی بے تکلف مجالس میں یار لوگ ایک دوسرے پر خوب پھبتی کستے ۔ جن کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں ۔
ملول اور پریشان خاطر نظر آتے ۔ سرکاری باقیات کی وصولی میں انتہا درجہ کی سختی برتی گئی ۔ شرفا اور بااثر
زمیندار اور متبد لوگ بے آبرو ہوئے ۔

صوبہ ہرات کا نائب شہر نو کے چوراہا میں متعین جاتا ۔ مامورین میں سے جو کوئی مغربی لباس میں باہر
نہ نکلتا ۔ اس کے کپڑوں کو قینچی سے کتر کر خراب کر دیتا ۔ ایسے قوانین میری نظر سے گزرے ۔ جن کی رُو سے کوئی
عورت بنہ ہندستانی برقعہ پہن کر حدود جدیہ کابل میں نہ چل پھر سکتی تھی ۔ اور نہ ہی کوئی مرد بلا ہیٹ
اِن حدود میں باہر نکل سکتا تھا ۔ اِن پابندیوں نے دیہاتیوں کا شہر میں آنا جانا بند کر دیا ۔ شہر کابل کے
باشندوں کا دار و مدار بھی زیست کی اُن خورد و نوش اشیا پر تھا ۔ جو دیہات سے شہر میں لائی جاتیں ۔
جس علاقہ کا زیادہ تعلق شہر کابل سے تھا ۔ وہ علاقہ کوہ دامن و کوہستان کا تھا ۔ اور اس جگہ کا رہنے

والا بھی حبیب اللہ بچہ سقاؤ تھا ۔ اُدھر اس علاقہ کے لوگ اپنی ضروریات کا مال و سامان شہر کابل
سے لانے میں رُک گئے ۔ میں نے معتبر ذرائع سے سُنا کہ انگریزی ٹوپی اور سوٹ پہننے کے حکم نے کابل میں
کنجڑوں اور نان بائیوں کو ٹاٹ کے سوٹ پہنوائے ۔ اس حکم سے ابتداء میں شہر کابل کے سکھ باشندے
بھی نہ بچ سکے ۔ ان کو کافی سختی جھیلنی پڑی ۔ بعد میں مُستثنےٰ قرار دیئے گئے ۔ مکتبی برقعہ کے استعمال کے
حکم نے کوئی کم قیامت برپا نہ کی تھی ۔ خویش و اقربا کا ملنا جُلنا بند ہو گیا تھا ۔ نہ کوئی گھر سے چھوٹے ، اور
ملے ۔ پرانی عورتیں کیسے اتنی جلدی قدیم ہندوستانی برقعہ ترک کر دیتیں ۔ بیرون دیہات سے عورتوں
کا آنا جانا بند ہو گیا تھا ۔ شہر سے کئی قدامت پسند خاندان دیہات میں جا بسے ۔ ایک دو خاندان سیکڑوں
میل کا دشوار گزار سفر طے کر کے ہرات پہنچے تھے ۔ کہتے کہ کابل میں زندگی دوبھر ہو چکی تھی ۔

جمعہ کی جگہ دوسرا دن تعطیل عام کے لئے مقرر ہوا جس کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا گیا ۔ طالبات بے پردہ
والدین کے منشاء کے خلاف مغرب میں تحصیل علم کے لئے بھیجی گئیں ۔ المختصر نئی نئی اصلاحات یکے
بعد دیگرے جلدی جلدی رعایا کے گلوں میں احکام کی شکل میں ٹھونس دی گئیں ۔ جن کو اس وقت کا ملک
ابھی نگلنے کا اہل نہ بنا تھا ۔ عوام سمجھتے کہ سیاحتِ یورپ نے شاہ کو سچ مچ بے دین بنا دیا ہے ۔ اسی قسم
کا غلط پروپیگنڈا شاہ کی عدم موجودگی میں پہلے ہی ہو چکا تھا ۔ فضاء مکدر ہوتی گئی ۔ اور اگر شاہ کو اس
کا علم بھی تھا ۔ تو اس نے دُور اندیشی سے کام نہ لیا ۔ اور یہ کر وہ اچھا نباض نہ تھا ۔ شاہ نے اپنے لوگوں کو
تہذیب نو میں کم از کم ترکوں اور ایرانیوں کے ہم پلہ دیکھنا چاہا ۔ افغان ترک نہ تھے ۔ ترک لوگ صدیوں
سے اہلِ مغرب کے قرب میں رہ کر ایسے ماحول کو رد و کد کے بعد قبول کر چکے تھے ۔ اور ان کا احاطہ نظر وسیع
ہو چکا تھا ۔ معاشرتی تبدیلیاں زیادہ تر دیکھا دیکھی بتدریج حال ہوتی ہیں ۔ سختی اور اصلاحی قانون سازی ردِ عمل
پیدا کر سکتے ہیں ۔ افغانستان کے شہری لوگ قدرتی طور پر خوش پوش اور خوش خور ہیں ۔ امیر شہید کے
زمانہ میں جس قدر قیمتی لباس پہنا جاتا یا فیشن کیا جاتا ۔ امیر امان اللہ خان کے زمانہ میں اب اس کا عشرِ
عشیر بھی باقی نہ تھا ۔ لیکن بغاوت کی آگ صرف امیر امان اللہ خان کے عہد میں بھڑکی ۔

مذہبی پیشواؤں کی مخالفت کو دبانے کے لئے حکومت نے شاید بے تحاشا سختی سے کام لیا۔ جنہوں نے حکومت کے خوف سے ماو فرار اختیار کی۔ اور محفوظ اندرونی علاقوں میں جا پہنچے۔ جہاں جب بھی ان کو موقع ملتا۔ حکومت کے خلاف آواز بلند کرتے۔ ملک کے عام لوگ عام طور پر اپنے علماء کا ادب واحترام کرتے تھے۔ کابل میں بازار شور کے ایک بزرگ جو ملا شور بازار کے نام سے یاد کئے جاتے۔ بڑے ادب واحترام سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا حلقۂ اثر اطراف افغانستان میں بہت وسیع تھا۔ یہ بزرگ بھی حکومت کے زیر عتاب آئے۔ میرے ایک دوست مہاجر ہندی رحمت اللہ صاحب نے اپنے قندھار کے قیام کے دوران میں مجھے بتایا۔ کہ سفارت خانہ برطانیہ کا ایک ذمہ دار غیر مسلم عہدہ دار اس بزرگ کو جب کبھی ملنے کے لئے جاتا۔ تو دوزانو ہو کر اس بزرگ کے سامنے فرش پر بیٹھتا۔ اور عجیب نہیں کہ مصلحتاً عام کابلی رسم کے مطابق ان کے دست مبارک کا بوسہ بھی لیتا ہو۔ اور ایسی روش ایک عیار ڈپلومیٹ سے بعید از قیاس بھی نہیں کہی جاسکتی۔ جبکہ عربستان کا لارنس اور ایسے ہی دوسرے ہوشیار ڈپلومیٹ اس دنیا میں کارہائے نمایاں دکھا چکے ہیں۔ جنہوں نے غیر حکومتوں کو زبردست دھوکہ اور فریب میں کئی کئی سال مبتلا رکھا۔ اور اپنی ریشہ دوانیوں کے طفیل ان کے اندرونی نظام اور امن کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اور ان کی گردنوں کو غلامی میں جھکا دیا۔ اور ان سوادوں کو صدیوں کے لئے خاک ودھول میں پچھاڑ دیا گیا۔

۱۹۲۸ء کا انقلاب

امیر امان اللہ خان کے سفر یورپ سے واپس آنے کے چند ماہ میں ہی بغاوت کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس دفعہ ابتدا کار سمت مشرقی سے ہوئی بتا گیا کہ مردان شنوار نے سب سے پہلے قدم میدان میں رکھا۔ جلال آباد اور پشاور کی درمیانی شاہراہ رک گئی۔ اس پر آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ حکومت نے تالیف قلب کی چال چلی۔ لیکن ہنڈیا نہ چڑھی۔ آخر سپاہ بھیجی گئی مگر وہ کچھ کام نہ کر سکی۔ شہر جلال آباد باغیوں کے ہاتھوں محصور ہوا۔ اور بعد میں نذر آتش ہوا۔ شہر کی بیرونی سرکاری عمارات جلا کر خاکستر بنا دی گئیں۔ جبہ خانہ (میگزین) کا کچھ حصہ جل گیا۔ جو بچا

وہ لوٹ لیا گیا۔ سردار علی احمد جان اُسی وقت والئے کابل تھا۔ امن بحال کرنے کی غرض سے جلال آباد بھیجا گیا۔ بعد ازیں بلیغ اور تنگ و دو بسیار اور بعرف زر کثیر کامیابی کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی۔ جہاں ۱۹۲۴ء کی بغاوت میں ہندوستان سے عبدالکریم خاں افغان فرار ہو کر ملک افغانستان میں طالع آزما ہوا تھا۔ اب وہاں محمد عمر خان افغان الہ آباد ہند سے بھاگ نکلا اور شورش زدہ علاقہ میں آدھمکا۔ اس لئے کہ اپنے بزرگوں کا کھویا ہوا تخت و تاج دوبارہ حاصل کرے۔ مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی۔ کابل کے دوسری جانب کوہ دامن کے لوگوں نے بھی انگڑائی لی۔ اس علاقہ کے ایک غریب طبقہ کے تاجیک فرد نے جو شاید قسمت کا مغرور سپاہی تھا۔ ان لوگوں کو اپنے بڑھتے ہوئے اثر سے متحد کر لیا۔ وہ اچھا خاصا راہزن بن گیا۔ لوٹ کھسوٹ میں ان کو شریک کرتا۔ اس شخص کا نام حبیب اللہ تھا۔ اور عام طور پر تحقیراً بچہ سقاؤ کہہ کر پکارا جاتا۔ لوگ کہتے کہ وہ ایک سقاؤ کا بیٹا تھا اور یہ کہ اپنے باپ کی پہلی بیوی سے تھا۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ اپنے باپ اور سوتیلی ماں کی سختی اور بے اعتنائی سے بگڑ کر ٹھیک راستہ کھو کر نڈر ہو گیا ہو۔ اور ملک کی قانونی پابندیوں سے آزاد۔

بعد میں ۱۹۲۹ء میں مجھے قندھار شہر کی کوتوالی میں ایک بار بچہ سقاؤ حبیب اللہ کے باپ کو اچھی طرح قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ میرے ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس سے پہلے اُسی روز وہ بازار شاہ میں پیادہ پھر رہا تھا۔ سفید شلوار اور قمیص پہنے کمر پر سرخ ملتانی زرد پٹکہ کسے ہوئے تھا۔ لمبا تھا۔ اور ذرا جھک کر چلتا تھا۔ عمر میں تقریباً ستر سال کے قریب ہو گا۔ یا کچھ زیادہ۔ بظاہر سنجیدہ اور دانا معلوم دیتا تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ کر گرال کو کہنے لگا۔ عورتوں کو سمجھ دل میں جاننے سے روکو

حبیب اللہ قید سے فرار ہو کر ڈاکہ ڈالنے لگا تھا۔ اور اپنی جان کو موت سے چھپائے پھرتا تھا۔ جیسا کہ قاعدہ ہے۔ اسے اپنی قماش کے ساتھی مل گئے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے ساتھیوں کی جمعیت بڑھ رہی تھی۔ اب مضافات کے سرکاری خزانے اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہے تھے لوٹ کا مال اپنے علاقہ کے لوگوں میں فراخدلی سے تقسیم کرتا۔ جو کچھ خوف سے اور کچھ لالچ میں

چشم پوشی کرتے۔ اور حبیب اللہ کو پناہ دیتے۔ اب علاقہ کے بڑے بڑے لوگ بھی اس زمرہ میں شامل ہو گئے اور حبیب اللہ گھر میں بالکل محفوظ ہو گیا۔ کابل سے پولیس تعاقب میں نکلتی۔ لیکن بے نیل و مرام واپس لوٹتی جب کبھی شاہ پریشانی ظاہر کرتا۔ تو مصاحب شاہی یہ کہہ کر تسلی دیتے۔ آخر مفرور ہی تو ہے۔ حکومت کا کب تک مقابلہ کرے گا۔ آج نہیں کل اس بدمعاش کی گردن ہو گی۔ اور پھر دار کے رستے کا پھندا۔ ایسے جیسیوں آئے اور چلے گئے۔ اور چلے جائیں گے۔

حبیب اللہ کا ہر دوسرا ڈاکہ کامیاب تر ثابت ہوا۔ پے در پے کامیابیوں نے اُس کا حوصلہ بلند کر دیا۔ اور اس کے نڈر ساتھیوں کی تعداد کئی گنا ہو گئی۔ اور ایک وقت آیا۔ وہ بادشاہت کا خواب دیکھنے لگا۔ ہو سکتا ہے۔ شاہ کے صاحب اقتدار اندرونی مخالفین در پردہ حبیب اللہ کی پشت پر ہوں۔ اور اس کی پشت پر بیرونی طاقت بھی ہو۔ جیسا کہ عام خیال تھا۔ ہمسایہ دولتیں ہر دور اپنے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہوتی آئی ہیں۔ اور حبیب اللہ ایک آلۂ کار ان کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔ جو شاہ کی تخت سے علیحدگی کا ذریعہ بن سکتا ہو۔ یا کم از کم ملک کی کمزوری کا باعث بن سکتا ہو۔ یہ بھی حقیقت ہو کہ مامورین حکومت بہ خیال مذہب اور بہ خیال ملی شاہ سے برگشتہ ہو چکے ہوں۔ یا کم از کم بے غرض اور بے اعتنا ہو گئے ہوں۔ حبیب اللہ کو در پردہ سرکاری اسلحہ اور گولی بارود بھی سرکاری مامورین پہنچانے لگے ہوں۔

سیاحت یورپ کے بعد حکومت نے اعلان کیا۔ کہ از آں بعد راشی سخت سزا کا مستوجب ہو گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں صوبہ ہرات کا چیف آف پولیس (کوتوال) محمد محفوظ خاں پشاوری پہلا مامور تھا۔ جو مرکزی حکومت کی گرفت میں آ گیا۔ اسے عبرت ناک سزا دی گئی۔ سنا گیا اُسے ایک لاکھ روپیہ نقد جرمانہ ہوا۔ اور چودہ سال قید با مشقت کی سزا ملی۔ اس سے پہلے کسی مامور سلطنت کو اتنی شدید سزا نہ دی گئی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا۔ کہ محمد محفوظ خان کو کابل میں سرکاری دفاتر میں پھرایا گیا۔ تاکہ دوسرے مامورین کو عبرت ہو۔ ؟ ... ذ خاں تبع افغانی تھا۔ اس کا

باپ احمد جان پشاور سے آکر یہاں کابل میں آباد ہوا تھا۔ اور حیات اللہ خان کا اس کی سرداری کے زمانہ میں اتالیق رہ چکا تھا۔ اور شاید شاہ امان اللہ خان کا بھی۔ اب افغانستان میں اس کا واحد گھر تھا۔ اس لئے محمد محفوظ خان جیسے بے قوم اور بے سہارا کا ایسا استعمال کیا جانا وقت کے تقاضا کے عین مطابق اور موزوں سمجھا گیا تھا۔

انقلاب نے بہت جلد ہی اسے آزاد کر دیا۔ مگر وہ اب وہ جذبۂ انتقام میں دیوانہ وار ہوگا۔ اسے اب امیر حبیب نے اپنے قریب کر لیا تھا۔ آدمی کارکن اور ہوشیار تھا۔ اُس نے بڑی گرمجوشی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ جہاں موقع ملا۔ اُس نے خوب ہمت دکھائی۔ یہاں تک کہ سردار نادر خان نے سرحدی علاقہ سے جب کہ وہ امیر حبیب اللہ سے برسرِ پیکار تھا۔ محمد محفوظ خان کے باپ احمد جان کو کہلا بھیجا۔ کہ وہ اپنے بیٹے کو سمجھائے اور روکے کہ وہ اب امیر حبیب اللہ کا ساتھ چھوڑ کر سیاسیات سے کنارہ کش ہو جائے۔ اور مخالفت چھوڑ دے۔ لیکن قدرت کو منظور اس طرح تھا۔ کہ محمد محفوظ خان امیر حبیب اللہ کے پہلو میں ایک ہی رنگ رسی کے پھندا میں دم توڑے۔

امیر غازی تھا حاجی نہ بنا!

سیاحتِ یورپ پر جانے سے پہلے جہاں لبد مغربی وکیل نے شاہ کو دعوت نامے بھیجے۔ وہاں سُنا گیا۔ کہ ارضِ پاک کے محافظ اور روضۂ اطہر کے پاسبان سلطان ابنِ سعود کی طرف سے بھی شاہ کو دعوت آئی۔ لیکن کابل کے دربار میں شاہ کا پروگرام بن چکا تھا۔ اس میں ترمیم کی گنجائش نہ ملی۔ لہٰذا بدقسمتی سے اس دعوت نامے سے فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ شاہ نے تین ماہ ممالکِ غیر کی سیر میں خرچ کر دیئے۔ واپسی پر اس کا عرب کے شمال سے گزر ہوا۔ حج کے دن تھے۔ لیکن حج کے ایام سے فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ اگر امیر ایک حج اس وقت کر لیتا تو کوئی بھی پروپگنڈا اُس کے خلاف کامیاب نہ ہوتا۔ غازی پہلے ہی تھا۔ حاجی بن کر اپنے ملک میں واپس آتا۔ اور غازی حاجی کہلاتا۔ لوگ اپنا تن من اس پر قربان کر دیتے۔ اور وہ ان کے دلوں پر راج کرتا۔

لیکن شاہ کچھ ایسے ماحول میں گھر چکا تھا۔ کہ اُس نے اندھا دھند مغرب کی تقلید کی۔ اور چاہا
کہ دنوں میں اس کا ملک مغربی تہذیب و تمدن میں ڈھل کر رنگا جائے۔ میں ہرات میں تھا۔ شاہ کے رفیقِ
سفر غلام صدیق خان کے پاؤں میں موچ آگئی۔ اس کو دیکھنے گیا۔ تو دیکھا کہ لکڑی کے کھوکھے بنے پڑے
تھے۔ اور ان پر لکھا تھا "ہیٹ" میں سمجھا کہ شاہ کے اپنے استعمال کے لئے خاص مغربی ٹوپیاں ہوں گی۔
لیکن اس کی اصلیت بعد میں کھلی۔ جب کابل میں ایک بڑا جرگہ منعقد ہوا۔ اور اس میں ملک کے ہر گوشہ
سے نمائندہ ممبران شامل ہوئے۔ یہ لوئی جرگہ اصل میں ایک بڑی ملکی پارلیمنٹ تھی۔ اس جرگہ میں شامل
ہونے سے پہلے سنا گیا کہ نمائندگان کو اپنی داڑھیوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اور ان کو انگریزی
ٹوپیاں پہنائی گئیں۔ غالباً یہ ٹوپیاں انہیں کھوکھوں میں بند تھیں۔ اور یورپ سے ایک منصوبہ کے تحت
اسی مقصد کے لئے لائی گئی تھیں۔ اس جرگہ میں شاہ نے ملکہ ثریا کے بطن سے اپنا بیٹا رحمت اللہ جان
کو ولی عہد مقرر کیا تھا۔ حالانکہ شاہ کا اس سے ایک بڑا بیٹا پہلی بیوی یا لونڈی سے ہدایت اللہ جان
مغرب میں اس وقت زیر تعلیم تھا۔

ہر طرف ملکی بغاوت نے حکومت کو مفلوج کر دیا۔ وفادار سپاہ کافی نہ رہی۔ موسم زمستان
میں وقت پر اطراف سے سپاہ بطورِ کمک مرکز میں نہ پہنچ سکتی تھی۔ ذرائع آمد و رفت پرانے
اور ناقص تھے۔ کابل پہنچنے میں کئی ماہ لگ جاتے۔ مرکز میں زیادہ حصہ سپاہ کا کوہ دامنی تھا۔
جو اب وفادار نہ تھا۔ علاوہ ازیں سپاہی جنگ آزمودہ نہ تھے۔ اکثر سپاہی دو سال سے زیادہ
دیر کے نہ تھے۔ کیونکہ جبری بھرتی ہشت نفری کے اصول پر صرف دو سال کے لئے بھرتی ہوتے تھے۔
افسرانِ فوج بھی زیادہ تر نوجوان اور ناتجربہ کار تھے۔ چنانچہ جب ہرات سے چل کر قندھار کا کچھ حصہ
بطورِ کمک مقام مقر پہنچا۔ تو شاہ خود تخت سے دستبردار ہو کر کابل سے عازم قندھار ہو چکا تھا۔
مقام مقر میں ان سے ملا۔ صوبہ ترکستان سے کمک نہ پہنچ سکتی۔ کیونکہ راہ میں برف سے ڈھکا

ہوا بلند و دشوار گذار کوہ ہندو کش حائل تھا۔ رسالہ شاہی کے قندھاری سپاہیوں نے آخر ساتھ دیا۔ جو پیشتر شاہ کے حکم سے قندھار پہنچے۔ شاہ اپنے بال بچوں کو پہلے ہی ۲۰ دسمبر ۱۹۲۸ء کے دن قندھار بھیج چکا تھا۔ حبیب اللہ کے حملوں کی تاب نہ لا سکا۔ اپنے گرد و پیش کو ناموافق پایا۔ سمجھ گیا۔ کہ تخت کو برقرار رکھنا امر دشوار ہے۔ اس خیال سے کہ بادشاہی کم از کم اس کے اپنے خاندان سے باہر نہ جائے۔ تخت کے اصلی حقدار سردار عنایت اللہ خان کے حق میں تخت کابل سے ماہ جنوری ۱۹۲۹ء میں دستبردار ہو گیا۔ اپنے رفقاءِ خاص کو ساتھ لیا۔ اور زمستان میں موٹروں میں جیسا تیسا قندھار پہنچ گیا۔ سردار عنایت اللہ خان کا خیال کوہستان میں تھا۔ خیال ہو گا۔ شاید کوہ دامن کے لوگ اس بات کا پاس کریں۔ مگر بغاوت کا رنگ نہ بدلا۔ حالات تدریج خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ سردار عنایت اللہ خان کی حکومت ارگ (قلعہ) کی چار دیواری میں محدود رہی۔ سنا گیا۔ کہ حبیب اللہ شہر سے دو میل باہر باغ بالا میں انگریزی سفارت خانہ کے قریب فاتحانہ انداز میں آ بیٹھا تھا۔ سردار عنایت اللہ خان کو کہا گیا۔ کہ اس کا اب کابل میں رہنا بے سود ہے۔ اگر حکومت میں کچھ جان باقی ہوتی تو شاہ امان اللہ خان ہی کیوں تخت کو چھوڑ جاتا۔ حبیب اللہ بچہ سقاؤ نے سردار عنایت اللہ خان کو ہندوستان جانے کی اجازت دے دی۔ اور ادھر خود ارگ میں فتح کے نشہ میں سرشار داخل ہو گیا۔ اور امیر حبیب اللہ خان کے نام سے تختِ کابل پر قابض ہو گیا۔ ایک غریب سقاؤ کا بے سر و سامان بچہ مفرور اور مغضوب۔ ببیں تفاوت راہ است از کجا تا بکجا۔ اللہ کا ملک ہے جسے چاہے دے۔ یہ آنکھوں والوں کے لئے عبرت کا مقام ہے۔ بچہ سقاؤ اعلیٰ حضرت امان اللہ خان کے باپ امیر شہید کا ہم نام تھا۔ اور یہ ایک کھلا راز تھا۔ کہ امیر شہید حبیب اللہ خان کے قتل میں امان اللہ خان کی خیر خواہ پارٹی کارفرما تھی۔ مندرجہ ذیل بیان اس خیال کی تائید میں بے جا نہ ہو گا۔

۱۹۱۹ء میں طالب علمی کے زمانہ میں میرے ہم جماعت اور ہم مسکن عبدالرحیم نے بتایا کہ یہ دن مارشل لاء کے تھے۔ اور امیر امان اللہ خان کی زیرِ قیادت افغانستان کے اعلان جنگ کرنے کے

ایک ہندی مدرس چار پانچ سال قبل کابل کا حبیبیہ سکول چھوڑ کر لاہور اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس کے کابل چھوڑنے کی وجہ مدرس موصوف نے یہ بتائی تھی۔ کہ اس نے ایک رات خلاف توقع سردار امان اللہ خان کی قیام گاہ پر ڈاکٹر عبدالغنی اور مدیر محمد حسین کو سردار صاحب کے ساتھ اس کے کمرہ خاص میں بغیر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ حالانکہ ان دو صاحب کی جائے اقامت اُن دنوں کابل کا بندی خانہ تھا۔ اور یہ منظر اُس نے بلا قصد اتفاقاً کمرہ کے دروازہ کی درز میں سے دیکھا تھا۔ مدرس حسب معمول سردار صاحب کے درس کے لئے وہاں گیا تھا۔ مدرس موت کے خوف سے اس درجہ وحشت زدہ ہوا۔ کہ وہ الٹے پاؤں وہاں سے باہر نکل آیا۔ اور یہ سوچ کر کہ عنقریب اس ملک میں ایک فتنہ برپا ہونے والا تھا۔ بغیر تاخیر مزید رخصت لے کر ہمیشہ کے لئے ہندوستان واپس آ گیا تھا۔ ہندوستان میں ایسا بے غرض اور بدوں لالچ تذکرہ بے معنی نہیں ہو سکتا تھا۔ انقلاب افغانستان ۱۹۱۹ء کے سلسلہ میں سردار امان اللہ خان کا ملک پر بالآخر قبضہ جمانا اِس گئی گزری بات کو تازہ کرنے کے لئے کافی تھا۔

اگر یہ درست تسلیم کر لیجئے۔ تو گویا قُدرت نے انتقام لیا۔ باپ کے نام کے ایک ادنیٰ شخص کے ہاتھوں اعلیٰ حضرت امان اللہ خان ذلیل و رسوا ہوا۔ اور اس پارٹی کے سارے افراد اپنے محبوب وطن سے تتر بتر ہو کر رہ گئے۔

میں ہرات میں تھا۔ شفاخانہ ملکی کے باورچی محمد یوسف نے مجھے بتایا۔ کہ وہ ازیں قبل ہرات کے مدیر نفوس کا ناظر تھا۔ اور اسے گورنر ہرات سردار محمد سرور خان کی مجلس میں اپنے مدیر کے ہمراہ جانے کا اتفاق ہوتا۔ اُس نے وہاں سُنا کہ وزیر امینہ جو بڈھے گورنر سردار محمد سرور خان کی جگہ گورنر ہرات بن کر آیا تھا۔ امیر شہید کا اصل قاتل تھا۔ جس نے گولی چلائی تھی۔ اور یہ بات میرے لئے نئی نہ تھی۔ میں کابل میں بھی ایسا سُن چکا تھا۔ زبان خلق نقارۂ خدا ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وزیر امینہ اُس زمانہ میں اُس نوجوان حلقہ کا ایک جزو تھا۔ جو امیر شہید کے گرد جمع کر رکھا تھا۔ امیر شہید اپنے والد محترم امیر عبدالرحمٰن خان کی طرح نوجوان لڑکوں کو خدمت خاص کے لئے اپنے گرد جمع رکھتا تھا۔

اور یہ لڑکے اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہوتے۔ جو بعد ازاں ملک کے اعلیٰ عہدوں پر بطور معتمد فائز کئے جاتے۔ شاید ان کو غلام بچے کہا جاتا تھا۔ اور یہ باری باری رات کے وقت امیر کے پہرہ دار بھی ہوتے۔ باورچی نے مجھے یہ بھی بتایا۔ کہ مدیر آئینہ شکل و صورت اور ڈیل ڈول میں اعلیٰحضرت سے بہت ملتا جلتا تھا۔ اس سے لوگوں کو اکثر دھوکا لگتا۔ وزیر آئینہ کو شاہ نے اپنی تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہرات کا گورنر بنا کر کابل سے باہر بھیج دیا تھا۔ اور پھر وہاں سے بعد میں مسکاؤ میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ انقلاب سے پہلے دوبارہ واپس افغانستان میں آنے کا اسے اتفاق نہ ہوا۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ کام نکلنے کے بعد محسن راز کی خاطر یا تو موت کی نیند سلا دیئے گئے یا ملک بدر کر دیئے گئے۔

سردار علی احمد جان ابھی تک سمت مشرقی میں معروف پیکار تھا۔ جب امیر حبیب اللہ کا تخت کابل پر قابض ہونے کا سنا۔ تو ایک بار پھر اس نے خوب زور لگایا۔ اور ہو سکتا ہے۔ اس میں اُس کا اپنا ذاتی مفاد مضمر ہو۔ لیکن شکست کھا کر مایوس ہندوستان کے راستہ قندھار میں وارد ہوا۔ صوبہ ترکستان کا جرنیل غلام نبی خان شاہ کے حق میں تھا۔ لیکن امان اللہ خان کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

صوبہ ہرات میں بغاوت ہوئی۔ نائب الحکومہ محمد ابراہیم خان کو باغیوں نے بڑی بے رحمی سے ہلاک کر ڈالا سنا گیا کہ افغان سفیر مسکاؤ شجاع الدولہ صوبہ ہرات میں ایک کامیاب اور ہر دلعزیز نائب الحکومہ رہ چکا تھا۔ ماسکو سے حالات کو بحال کرنے کی غرض سے ہرات پہنچا۔ لیکن ماحول کو ناسازگار پا کر واپس مسکاؤ چلا گیا۔ ہرات کی فوج کا محبوب فرقہ مشر غوث محمد خان بے بس تھا۔ ہراتی سپاہ نے ساتھ چھوڑ دیا۔ عبدالرحیم خان کوہستانی اونچا لمبا جوان میرے زمانہ میں ہرات کی سپاہ میں غنڈ مشر کے عہدہ پر فائز تھا۔ ہوشیار تھا۔ اور من چلا دلاور۔ اثر و رسوخ میں آگے آگے۔ انقلاب سے پہلے تبدیل ہو کر کابل چلا گیا تھا۔ اب

امیر حبیب اللہ کی طرف سے چند کوہستانی سپاہی ساتھ لئے ہرات پہنچا۔ اور بلا کسی مزاحمت بسیار ہرات پر متصرف ہو گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ زمانہ سازہ ہراتی سپاہی لڑنے سے انکاری ہو گئے۔ اس خطہ کے لوگ ہمیشہ انقلابی عنصر کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔ ہرات میں میرا ایک ملنے والا ان کو سلیمانی کہا کرتا۔ ہرات میں میں نے سُنا۔ کہ ان سپاہیوں کو سردار محمد ہاشم خان اور سردار غلام نبی خان جیسے طاقتور فوجی اور ملکی افسر بغاوت سے نہ روک سکے۔ بجان بچا کر واپس کابل چلے گئے۔ اور سردار محمد ہاشم خان ایک گوہر تھا جس کے گن گاتے میں نے ہراتیوں کو کئی بار سنا۔ سردار محمد ہاشم خان، سردار نادر خان کا بھائی تھا۔ مجھے بتایا گیا۔ کہ ہرات شہر میں کسی کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ سپاہی لوگ اپنی من مانی کرتے۔ لڑکے لڑکیوں کو اٹھا لے جاتے۔ اور ان سے باز پرس نہ ہوتی۔ سردار محمد ہاشم خان نے ہرات آتے ہی اعلان کر دیا کہ ازیں بعد لوگ گھروں کے در کھلے رکھیں گے۔ لوگ حیران و پریشان ہوئے۔ لیکن حکم سے انحراف نہ کر سکے۔ چوروں اور بدمعاشوں کو چن چن کر عبرت ناک سزائیں دیں۔ امن بحال ہو گیا۔ چوری چکاری ختم ہو گئی۔ ایک چور فتح نامی کو لوہے کے پنجرہ میں بند کر کے شہر کے در پر لٹکا دیا گیا۔ اور پھر روزانہ اس کی پشت پر بید لگائے جاتے۔ یہاں تک کہ مزید سزا کی تاب نہ لا کر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ایک ایسے ہی بدمعاش کو اونٹ پر بٹھا کر باندھ دیا گیا۔ اس کا پیٹ چاک کر دیا گیا۔ اور شہر میں پھرایا گیا۔ کہ بلاشہ اس کی آنتیں اونٹ پر بکھر کر لٹک رہی تھیں۔ ایسی ہی اور قسم قسم کی سزائیں ڈراؤنی دے کر ملک کو بدمعاش عنصر سے پاک کر دیا۔

ملکہ ثریا خانم بال بچوں سمیت قندھار میں

۱۴ر دسمبر ۱۹۲۸ء مطابق ۲۸ برج قوس جمعرات کا دن تھا۔ اور دن کے تقریباً دو (۲) بجے ہوں گے۔ دو ہوائی جہاز کابل کی سمت سے پرواز کرتے آئے۔ اور قندھار کے شہر پر چکر کھانے لگے۔ پھر نیچے آ کر میدان طیارہ میں اتر گئے۔ طیاروں کے اترنے کے ایک گھنٹہ بعد میرا ہمسایہ عثمان میرے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ ایلو! امان اللہ خان تو کابل چھوڑ آیا۔ جو سُنتے ہی دھکا ہوا۔

بچہ سقاؤ تو کابل پر قابض ہو گیا جو ہوائی جہاز ابھی ابھی شہر پر گھوم رہا تھا۔ کیا اسے نہیں دیکھا۔ میں نے
کہا کہ دیکھا ہے۔ کہ بس اسی میں آتے ہیں۔ بال بچے تو ارگ کے حرم سرائے میں بھیج دیئے ہیں۔ خود طیارہ گاہ
کے پاس والے منزل باغ میں چھپا بیٹھا ہے۔ غالباً شام کی تاریکی میں وہ بھی حرم سرائے میں پہنچ جائیگا۔
پھر مجھے تسلی دی۔ کہ فکر کی بات کوئی نہیں۔ آپ اجنبی تو ضرور ہیں۔ لیکن یہاں پر کسی کا بال بیکا
نہیں ہو سکتا۔ کل تک میرے آدمی گاؤں سے یہ پہنچ جائیں گے۔ حویلی محفوظ ہو جائے گی۔ اس میں ذرا
اور خدشہ ہے کسی وقت خالی نہیں
شک نہیں۔ کہ یہ ملک افغانستان ہے۔

دن کے بارہ بجے کے قریب کوتوالی کا ایک سپاہی آیا۔ اور بولا کہ نائب الحکومہ نے یاد
کیا ہے۔ اور وہ خود انتظار میں حرم سرائے کے مردانہ میں بیٹھا ہے۔ ولی عہد رحمت اللہ جان
کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔ ہوائی جہاز سے بال بچے ابھی اترے ہیں۔ سپاہی رخصت ہوا
اور میں خود تیار ہو کر بازار سے ہوتا ہوا حرم سرائے کے سراچہ میں پہنچ گیا۔ بازار کا کچھ حصہ بند ہو چکا
تھا۔ لیکن کہیں کہیں لوگ ٹولی بنائے چپ چاپ باتوں میں مشغول نظر آئے۔ کانسٹیبلوں کی تعداد آج
معمول سے زیادہ تھی۔ وہ آج خلافِ معمول ہوشیار اور چوکنے دکھائی دیتے تھے۔ جو دکانیں کھلی
تھیں۔ ان کے مالکوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور دکانوں سے قیمتی مال نکال رہے تھے۔

حرم سرائے کے سراچہ (مردانہ) میں میں نے فوجی ڈاکٹر محمد علی خان کو کھڑا پایا۔ دروازہ پر
چند ایک سپاہی زرد کالر والے سرخ کوٹ پہنے اور سروں پر مغربی طرز کی فرانسیسی فوجی ٹوپی
لگائے پہرہ دیتے دیکھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سپاہی آج ہی ہوائی جہاز میں کابل سے پہنچے تھے۔
اور رسالہ شاہی کے افراد تھے۔

ان کے علاوہ کوئی اور فرد نہ دیکھا۔ جو کابل سے نو وارد ہوتا۔ اتنے میں قندھار کا گورنر
عبدالکریم خان بھی پہنچ گیا۔ اور ہم دونو ڈاکٹروں کو اپنے ہمراہ حرم سرائے کے اندر لے گیا۔ غلام
گردش سے گزر کر ہم نے ایک فراخ صحن میں قدم رکھا۔ صحن کے درمیان میں پانی سے لبریز ایک

خوبصورت حوض تھا۔ آج سے پہلے اس حرم سرائے میں قندھار کا گورنر خود مقیم تھا۔ صحن کے بائیں طرف پہلی منزل پر ایک کمرہ میں شاہ کی والدہ علیا حضرت شہزادہ رحمت اللہ جان کو پلنگ پر لئے بیٹھی تھی۔ سن میں کوئی پچپن سال کی ہوگی۔ دو چھوٹی شہزادیاں صحن میں کھیل رہی تھیں۔ وہ مغربی لباس زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ لباس کا رنگ چمکیلا سرخ تھا۔

علیا حضرت نے ولی عہد کی حالت بیان کی۔ ولی عہد عمر میں اس وقت کوئی سات آٹھ سال ہوگا۔ شکل کا بھولا بھالا خوبصورت لڑکا تھا۔ ابھی خاصی صحت تھی۔ طبیعت کوئی اتنی زیادہ خراب نہ تھی۔ ہوائی سفر کی وجہ سے کچھ سست پڑ گیا تھا۔ دوران پرواز میں قدرے دوران سر لاحق ہو گیا تھا۔ اور طبیعت میں کچھ استفراغ ہو گیا تھا۔ چنانچہ نسخہ تجویز کر کے ہم واپس باہر آ گئے۔ نائب الحکومت سے رخصت لیکر شفاخانہ ملکی میں چلا گیا۔ جہاں شفاخانہ کے منشی مرزا محمد جان نے بتلایا۔ کہ اگلے روز بوقت ۱۰ بجے صبح دن کے علیا حضرت سلام خانہ میں اہالی قندھار کو مخاطب کریں۔ تمام معززین شہر مدعو ہیں۔ بعد کی دوائی بھیج کر میں واپس گھر لوٹ آیا۔ شہر میں سکون تھا۔ کسی قسم کا شور و شر نہ تھا۔ البتہ افواہوں کی کمی نہ تھی۔ راہ میں ایک دو احباب سے ملاقات ہوئی۔ لیکن معاملات پر کسی نے کوئی خاص روشنی نہ ڈالی۔ شام کے قریب جب دوبارہ حرم سرا میں خیریت پرسی کے لئے گیا۔ تو کچھ اشتہارات کوتوالی کے چوراہا میں چسپاں دیکھے۔ پڑھنے والوں کی بھیڑ تھی۔ اشتہارات ریاست عسکری کی جانب سے تھے۔ جن میں کچھ احکام درج تھے۔ نئے اور پرانے سپاہیوں کو حکم دیا گیا تھا۔ کہ وہ سب فلاں روز تک ریاست عسکری میں حاضر آ دیں۔ میرے ایک اللہ دوست راستہ میں مجھے مل گئے۔ آپ کوہ دامن کے باشندہ اور سید تھے ایک طویل عرصہ ہندوستان میں گزار چکے تھے۔ غالباً پیدائش بھی ہند کی ہوگی۔ مجھے بتایا کہ کابل کی حالت از حد نازک ہو چکی ہے۔ شاہ نے بال بچوں کو یہاں بھیج دیا ہے۔ اور خود بھی آج کل میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ سچ کیوں نہ کہوں اصل بات یہ تھی۔ کہ آنا تو خود اس نے بھی ابھی آج کے جہاز میں تھا۔ اور خاص اہل کار اس امر سے آگاہ بھی کر دیئے گئے تھے۔ لیکن آئے نہیں۔ سنا نہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک دو روز اور بخت آزمائی

کرلے۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا۔ کہ غلام صدیق خان وکیل خارجہ اور حسن جان شاہ کا چھوٹا بہنوئی بھی شاہی بال
بچوں کے ہمراہ آئے ہیں۔ میرا دوست اس وقت ایک ذمہ دار سرکاری عہدہ پر مامور تھا۔ اس کا لہ
کچھ خوشگوار نہ تھا۔ میں نے کہا تو مبارک ہو۔ کل آپ ہی نے قندھار کا گورنر بننا ہے۔ بولا۔ تو اس
میں تعجب کی بات کونسی ہے۔ جب ایک سقاؤ کا بچہ کابل کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے۔ تو کیا میں جا
قندھار کی گورنری کے بھی قابل نہیں۔ باتوں باتوں میں سراچہ قریب آگیا۔ یہ کہہ کر کل کو نسا دن ہے
کچھ عیاں ہو جائے گا۔ مجھ سے علیحدہ ہو کر آگے سیر کے لئے نکل گیا۔

میں نے دیکھا کہ سراچہ میں ایک طرف ایک کمرہ میں نائب الحکومہ قندھار غلام صدیق خان اور سرا
حسن جان اکٹھے بیٹھے ہوئے پی رہے تھے۔ نائب الحکومہ کے اشارہ پر میں کمرہ میں داخل ہوا۔ ولی عہد
خیریت پوچھا۔ غلام صدیق خان سے مصافحہ ہوا۔ آپ جرنیل غلام نبی خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور ا
سے قبل ہرات میں میرے زیر علاج رہ چکے تھے۔ بڑے تپاک سے پیش آئے۔ ان سے معلوم ہوا۔ کہ شاہ
نے بچوں کو اس خیال سے بھیج دیا ہے۔ کہ وہ اطمینان اور یکسوئی سے امورات مملکت کو سلجھا سکے۔
کی باتوں سے معلوم ہوا۔ کہ وہ شاہ کے خاص معتمد ہیں۔ اور اسی خیال سے ان کو بچوں کے ہمراہ بھیجا گیا
ان سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ گزشتہ روز حکومت اور حبیب اللہ کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی
جس میں سینکڑوں جانیں تلف ہوئیں۔ بولے جب وہ سب کار میں سوار ہو کر کابل کے ہوائی اڈہ کی طرف
آرہے تھے۔ تمام راستہ میں انہوں نے بے شمار لاشیں پڑی دیکھیں۔ ریاست بلدیہ کو حکم مل چکا تھا۔ کہ
کو ٹھکانے لگائے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حبیب اللہ کا یہ دوسرا زبردست حملہ تھا۔ جو اس نے کابل پر کیا تھا

شام کی بڑھتی ہوئی سیاہی میں جب میں واپسی پر مردانہ کے بیرونی دروازہ پر پہنچا تو دیکھا۔
علیا حضرت شاہ کے چھوٹے بچوں کو سیر شام سے واپس لا رہی تھی۔ خود اس نے چمڑے کا لمبا اوور کوٹ پہن
تھا۔ پیشانی اور آنکھیں برہنہ تھیں۔ ناک کا نچلا حصہ اور منہ باریک دوپٹہ سے ڈھانپ رکھا تھا
ہاتھوں پر لمبے دستانے تھے۔ چھوٹے شہزادہ کی عمر کوئی دو ڈھائی سال کی ہوگی۔ بچوں کا

خاطب کیا اور بولے۔ اب یہاں سب علمائے کرام حاضر اور موجود ہیں۔ پس فیصلہ کریں۔ کہ کون کون سی اصلاحات شریع کے خلاف ہیں۔ اور کن پر نظرِ ثانی ہونی چاہیئے۔ پھر بولے کہ شاہ نے جو کچھ کیا۔ محض نیک نیتی سے کیا تھا۔ بہر صورت ہر اس اصلاح کو جو خلافِ شرع ہو گرانے کیلئے تیار ہیں۔ سب لوگ فرش پر بیٹھ گئے۔ علماء درمیان میں آ بیٹھے اور سلسلۂ بحث چھڑ گیا۔ اعتراضات کم نہ تھے۔ جن میں یہ بھی تھا۔ کہ جدید مکاتب بند کر دیئے جائیں۔ تعلیم صرف دینی ہو۔ لباسِ مغرب کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ عورتوں کو بے پردہ نہ کیا جائے۔ انگریزی ٹوپی ہرگز نہ پہنائی جائے وغیرہ وغیرہ بوجہ ضروری کام میں مجلس سے باہر آ گیا۔ اور نہ ہی مجھے ان باتوں سے چنداں دلچسپی تھی۔ یہ ملک کا گھریلو معاملہ تھا۔

امیر امان اللہ خان بھی قندھار پہنچ گیا

ملکہ ثریا کے آنے کے تھوڑے دنوں بعد ہی ایک دن ماہ جنوری ۱۹۲۹ء میں خبر آئی کہ شاہ کابل چھوڑ کر مقر پہنچ گیا ہے۔ مقر سے ٹیلیفون آیا ہے۔ کہ شاہ کے لئے کار بھیجی جائے۔ دراصل بات یہ تھی۔ کہ رباط آقوبہ کے علاقہ میں شاہ کی اپنی کار برفانی کیچڑ میں پھنس کر بے کار ہو چکی تھی۔ یہاں سے شاہ کرایہ کے ٹٹو پر سوار ہو کر مقر پہنچا تھا۔ زمستان کا موسم تھا۔ چلہ کلاں کی شدت تھی اور غزنی کا علاقہ جہاں سردی قہر کی پڑتی تھی۔ برف باری کی وجہ سے کچی سڑک گہری دلدل بنی ہوئی تھی۔ گاڑی کیچڑ میں ایسی پھنسی۔ کہ نکل نہ سکی۔ مقرا اور قلات کے بے پناہ سرد علاقے سب کے رنگ سیاہ کر چکے۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ کھانے کا موزوں انتظام نہ تھا مجھے شاہی گارڈ کے ایک جوان نے بتایا۔ یہ جوان شاہ کے ساتھ کابل سے نکلا تھا۔ شاہ کابل سے نکلتے وقت ایک دو نان خمیری اپنے کوٹ اور پتلون کی جیبوں میں ڈال لایا تھا۔ ایک جگہ غذا نہ

توشاہ لے ایک ایک ٹکڑا نان خمیری کا سب کو کھانے کے لئے دیا۔ اور یہ ان کا لنچ تھا۔

غرضیکہ زحمتیں جھیلتے اور مصائب سفر اٹھاتے اور لوگوں سے پردہ رکھے قندھار میں چوروں کی طرح پہنچے۔ جہاں پر نہ ہی آؤ بھگت ہوئی۔ اور نہ ہی کوئی فرد استقبال کے لئے باہر نکلا قندھار پہنچ جانے کے کافی عرصہ بعد لوگوں کو شاہ کے آنے کا علم ہوا۔ شاہ کا حرم سرائے میں قدم رکھنا تھا۔ کہ ہر طرف موت کی سی خاموشی چھاگئی۔ ساکنین حرم کے سر چکرا گئے۔ اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ رہی سہی آس ٹوٹ چکی تھی۔ سنا گیا۔ کہ علیا حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور وہ بے اختیار کہہ رہی تھی۔ میری باتیں کڑوی تھیں۔ میں نے بارہا کہا۔ کہ ان اصلاحات سے ہاتھ اٹھا۔ تیرا ملک ان کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہم سفید سر دل کی باتیں بے معنی نہیں ہیں۔ میرے بیٹے نے میری ایک نہ سنی۔ اور سنی ان سنی کر دی۔ اتنی محنت سے حاصل کیا ہوا تخت کھو آیا ہے۔ کاش یورپ نہ جاتا۔ اور نہ آج کا سیاہ داغ دیکھنا نصیب ہوتا۔

یہ بھی سنا گیا۔ کہ ملکہ ثریا کو باہر آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اندر کمرہ میں ہی بیٹھی رہی۔ شاہ کمرہ میں آیا اور بت بنا کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں پُر نم تھیں۔ اور اپنی ناکامیابی پر متاسف تھا۔ گیا وقت کیسے واپس آتا۔ اسی روز دن کے بارہ بجے کے قریب ایک سپاہی آیا۔ اور مجھے سراچہ میں بلا لے گیا۔ معلوم ہوا کہ شاہ نے ڈاکٹر کو طلب کیا تھا۔ ناظر باہر آیا۔ اور مجھے ہال کمرہ میں لے گیا۔ ہال کیا مختصر کمرہ میں مَیں نے ان اشخاص کو بیٹھے دیکھا۔ جو شاہ کے ہمراہ کابل سے آئے تھے۔ ایک کمرہ میں وزیر دربار محمد یعقوب خان شاہ خاصی اپنے عزیز قریبی رشتہ دار محمد عمر خان سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ہال کمرہ میں شاہ بادامی رنگ کے چمڑے کا لمبا کوٹ پہنے کھڑا تھا۔ سر سے ننگا تھا۔ سگار پی رہا تھا۔ چہرہ بے رونق تھا۔ رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے۔ جسم لاغر ہو گیا تھا۔ وہ جلال اور وہ

سرخی اور سپیدی جو میری آنکھیں چند ماہ قبل ہرات میں دیکھ چکی تھیں۔ باقی نہ تھی۔ میں نے سلام عرض کی۔ ناظر نے عرض کی کہ حسب الارشاد ڈاکٹر موجود ہے۔ کہا کہ ترکی ڈاکٹر نجم الدین سے کام تھا۔ غالباً ڈاکٹر موصوف چند روز قبل کاظم پاشا والے ترکی وفد کے ہمراہ قندھار آیا تھا۔ اور عازم کابل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر موصوف زچگی اور امراض النسّاء میں ماہر تھا۔ غالباً ملکہ حاملہ تھی۔ میں نے سلام عرض کیا اور باہر آگیا۔

صحن سراچہ میں کئی ایک اہل کار بُت بنے کھڑے تھے۔ غالباً احکام کے منتظر تھے۔ پیش خدمت دبے پاؤں اندر باہر آجا رہے تھے۔ میں پہرہ دار سے گزر کر باہر سڑک پر آگیا۔ جہاں عوام چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائے کمبل اوڑھے کھڑے باتوں میں مصروف و مشغول تھے۔ اور حرم سرائے کے دروازہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید شاہ کو دیکھنا چاہتے تھے۔

آج افواہوں کی کمی نہ تھی۔ میرے چپراسی نے عجیب وغریب افواہیں سنائیں۔ ذمہ دار افسران عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے۔ سوچتے کون سی جانب جھکیں۔ زمستان کا موسم تھا۔ بائیس پڑاؤ دُور کابل تھا۔ اصل کیفیت کیسے کھلے۔ ایک عرصہ پہلے ہی کابل سے ڈاک آنی بند ہو چکی تھی۔ قندھار کے گورنر نے حکم دیا۔ کہ شاہی جھنڈا بلند کیا جائے۔ شاہ نے روک دیا۔ اور کہا۔ کہ وہ اب ملک کا بادشاہ نہیں رہا۔ اس وقت امیر آغا لالہ عنایت اللہ خان ہے۔ بولا وہ اس کے ہاتھ پر بیعت کر آیا ہے۔ اور اب قندھار میں اس غرض سے آیا ہے۔ کہ آپ سب کی بیعت اس کے حق میں حاصل کرے۔ اگر کوہ دامن کے لوگوں نے بھی آغا لالہ (امان اللہ خان اپنے بڑے بھائی عنایت اللہ خان کو آغا لالہ کہہ کر یاد کرتا تھا)۔ کی بیعت کر لی۔ تو وہ پھر صوبہ ہرات اور صوبہ ترکستان میں جا کر وہاں کے لوگوں کی بیعت بھی اپنے بڑے بھائی کے حق میں حاصل کر لیگا۔ اور پھر کوہ ہندوکش پر سے ہوتا ہوا واپس کابل جا کر ایک عام شہری کی حیثیت میں وہاں رہے گا۔

لوگوں کو اس پر یقین نہ آتا۔ کوئی کہتا کہ شاہ ہمیں گمراہ کر رہا ہے۔ کوئی کہتا یہ ایک سیاسی چال ہے۔ جب امن بحال ہو جائے گا۔ تو مزید سردار عنایت اللہ خان بدستور سابق ایک شہری ہی ہوگا۔ اور امان اللہ خان امیرِ افغانستان۔ لوگوں کو ملک کے کوائف سے آگاہ کرنے کی خاطر امان اللہ خان نے اعلان کر دیا۔ کہ اگلے دن سلام خانہ میں ایک دربارِ عام ہوگا۔ اور وہ اس میں اہالی قندھار سے چند ایک باتیں کرے گا۔ وقت مقررہ پر دربار سراچہ کے جنوبی ہال میں منعقد ہوا۔ عصر کے وقت امان اللہ خان مجمع میں آیا۔ اور کہا کہ آج کے دربارِ عام سے میرا مقصد ہے۔ کہ آپ سب بھائیوں کو کابل کے صحیح حالات سے روشناس کر دوں۔ تاکہ آپ کی تشویش دور ہو۔ اور آپ ایک صحیح فیصلہ کر سکیں۔ حبیب اللہ علاقہ کوہستان کا ایک گم نام غیر افغان اور بد کردار شخص ہے۔ جو مذہب کی آڑ لے کر افغانستان کے ملک پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ مشرقی سمت میں کچھ لوگوں نے علم بغاوت بلند کر کے نالائقی کا ثبوت دیا۔ جس طاقت کو اکٹھا کرنے میں میں نے نو سال صرف کئے۔ اور میرا خیال تھا۔ کہ یہ قوت ملک کے استحکام اور استقلال کے قیام کی محافظ ہوگی۔ آج دیکھتا ہوں۔ کہ وہی قوت ہماری خانہ جنگی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ میری ذاتی آرزو تھی۔ کہ میری ملت دنیا کی آزاد اقوام میں کسی سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ میں نے ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا کہ روٹھی ہوئی ملت کو جو مجھے بمنزلہ اولاد کے عزیز ہے۔ اُسے نرمی سے سمجھاؤں۔ ملتِ افغانستان کا ہر فرد مجھے اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے نرمی سے ہی اُس کو اپنی کم فہمی اور کم بینی کا احساس کرایا۔ لیکن میں نے دیکھا۔ کہ میری ملت نے میری نیک نیتی اور خلوصِ دل کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ اب ان کی مخالفت سے آزردہ دل ہو کر میں نے تختِ افغانستان کو اپنے بڑے بھائی سردار عنایت اللہ خان کے سپرد کر دیا ہے۔ میں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ ازیں بعد ایک عام شہری کی

حیثیت میں اپنے وطن عزیز کی خدمت میں اپنی بقایا زندگی صرف کر دوں گا۔ دیکھنا
یہ بھی ہے۔ کہ آیا میرے مخالفین سردار عنایت اللہ خان کی اطاعت بھی قبول کرتے ہیں۔
یا نہیں کیان کا دلی مقصد اصلاحات کی وجہ سے صرف مجھے ہی تخت سے محروم کرنا تھا۔
میں حاضرین کو سچے دل سے یقین دلاتا ہوں کہ میں اب محض امان اللہ ہوں۔ ایک
معمولی شہری اور بس۔ آپ بھی میری طرح میرے بھائی عنایت اللہ خان کے حق
میں میرے ہاتھ پر بیعت کریں۔ ہاں اگر میرے بھائی عنایت اللہ خان کا بھی وہی حشر
ہوا۔ اور حبیب اللہ تخت کابل پر قابض ہوگیا۔ تو پھر مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ حاضرین
نے یک زبان ہوکر بآواز بلند کہا۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا دامن نہیں چھوڑ
سکتے۔ بچہ سقاؤ کو اپنی گردن پر سوار نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ہمارے نیک و بد پر
قادر نہیں ہوگا۔ اس شور و غوغا میں ایک دو آوازیں ایسی بھی سُنی گئیں۔ جو کہہ
رہی تھیں۔ کہ سنبھل کر قدم رکھنا یہ روسا منافق ہیں جھوٹ بکتے ہیں۔

اب ایک بار پھر لوگوں کی آنکھیں کابل کی طرف لگ گئیں۔ اس عرصہ میں
امان اللہ خان نے اپنے آپ کو مقبول خاص و عام بنانا چاہا۔ ایک دن شفاخانہ کے
ایک نوجوان چپراسی نے مجھے بتایا۔ کہ گزشتہ شام شہر سے باہر امان اللہ خان
کو اکیلا آتے دیکھا۔ اور پھر وہ ان کی گیند بازی میں شامل ہوگیا۔ گیند جب اس
کی طرف جاتی۔ تو پکڑ کر واپس پھینک دیتا۔ ایک دو منٹ کھیل کر چلا گیا۔ دو سہ
روز گزر گئے۔ کابل سے کوئی امید افزا خبر نہ آئی۔ ایک شام میں حرم سرا کے سراچہ میں
گیا۔ تو غلام صدیق خان نے میرے ہاتھ میں ہند سے آیا ہوا اخبار سٹیٹسمین کا ایک پرچہ
دیا۔ اور کہا ان دو سطور کا ترجمہ سنا دو۔ مطلب سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد
جلدی کا ہی امان اللہ خان کے پاس اندر چلا گیا۔ مرقوم تھا۔ کہ عنایت اللہ خان

تختِ کابل سے دستبردار ہو کر عازم ہند ہو چکا ہے۔ چنانچہ سردار عنایت اللہ خان ایک نہایت ہی مختصر سی چندروزہ امارت کرنے کے بعد بمعہ اہل و عیال براہ ہند قندھار پہنچ گیا۔ وزیرِ حربیہ عبدالعزیز خان اس کے ہمراہ آیا۔ سردار عنایت اللہ خان کے آنے کے فوری بعد خوانین کا مجمع ایک بار پھر طلب کیا گیا۔ جس میں امان اللہ خان نے کہا۔ خلافِ اُمید میرا بڑا بھائی امارت سے دست بردار ہو کر یہاں آ پہنچ چکا ہے۔ اب آپ بتائیں آپ کا کیا ارادہ ہے۔ اگر حبیب اللہ ہی کو اپنا امیر چاہتے ہیں۔ تو آپ لوگ مختار ہیں۔ خوانین نے جواب میں عرض کی۔ پہلے بھی آپ ہمارے سروں کے تاج تھے۔ اور اب بھی بدستور آپ کو ہی اپنا تاج دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر کہا تو اچھا میرے بڑے بھائی سردار عنایت اللہ کو اپنا امیر بنا لو۔ اور میں بطورِ معاون خدمتِ وطن انجام دوں گا۔ لیکن خوانین اور اکابرین ملّت ہم خیال نہ ہوئے۔ بالآخر امان اللہ خان کو ہی اپنا امیر منتخب کیا۔ اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ فوراً شاہی بیرق بلند ہوا۔ اس مجمع میں سردار عنایت اللہ خان بھی بذاتِ خود موجود تھا۔

امان اللہ خان نے ہرات جانے کی ٹھانی

اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان اب ایک بار پھر کارِ حکومت میں دلچسپی لینے لگا۔ انتظامیہ معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دفاتر کی از سرِ نو تنظیم ہوئی۔ نظام کی طرف توجہ دی۔ خوانین شہر اور علاقہ کو سکھایا پڑھایا۔ کہ کم از کم اپنے ننگ و ناموس کے تحفظ کی خاطر ہی بیدار ہوں۔ اور حکومت کے تعاون میں آگے آئیں۔ لیکن عملاً بظاہر سب کچھ بے اثر ہوتا دکھائی دیتا۔ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ خیال تھا۔ شاید یہ بے رخی اور بے توجہی اور جمود موسم سرما کی شدت کی وجہ سے ہو۔ چند روز اور گزر گئے۔ موسم زمستان زور پر تھا۔ علاقہ قندھار میں اگرچہ عام طور پر برف باری نہیں ہوتی

لیکن خشک سردی بعض اوقات خوفناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ سردی کی شدت فرو کم ہوئی تو شہر قندھار کے رئیس اعظم عبدالعلی خان پسر قاضی سعدالدین نے پہل کی۔ اور اپنے گاؤں سے کوئی دس پندرہ نوجوان اور بوڑھے بطور فوجی رضاکار لا کھڑے کئے۔ ان میں اکثر بڈھے تھے۔ اور بظاہر خدمت نظام کے ناقابل۔ اس تعداد میں بھی دیر تک کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ان لوگوں نے دو تین خیمے ارگ کے صحن میں نصب کر لئے تھے۔

شاہ جمعہ کے دن مسجد خرقۂ مبارک میں نماز جمعہ کے لئے جاتا۔ تو بعد نماز نطق فرماتا۔ بعض لوگ مذاق اڑاتے۔ مایوسی دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ ایک جمعہ کے دن ایک سفید ریش نے منہ پر یہاں تک کہہ دیا۔ کہ تو جھوٹا ہے۔ تیرے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاہ کو طیش آ گیا۔ تفنگچہ نکال لیا۔ اور بوڑھے کو مار دیا ہوتا۔ اگر سردار عنایت اللہ خان نے بیچ بچاؤ نہ کر دیا ہوتا۔ آج کے واقعہ نے شاہ کی کمر ہی توڑ دی۔ وہ بالکل حوصلہ ہار بیٹھا۔ ساتھ ہی ڈر گیا۔ کہ کہیں تنگ وقت میں یہ لوگ پھر جائیں۔ شاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ تب سے چوتھے روز قندھار چھوڑ کر ہرات کی طرف چلا جائے گا۔ چنانچہ اسی روز اس ارادہ پر عمل بھی شروع کر دیا۔ اپنی والدہ اور چھوٹی بہن سراج البنات کو طیارہ پر سوار کر دیا۔ کہ وہ ہرات چلی جائیں۔ سراج البنات حاملہ تھی۔

اپنے سفر کا تہیہ بھی کیا۔ المانی ساخت کی خاص دو بڑی بسیں سواری کے لئے تیار کیں۔ یہ دو بسیں حکومت جرمنی کی طرف سے سیاحت یورپ پر شاہ کو ملی تھیں۔ سردار عنایت اللہ خان کی بیوی کو بھی جو اس وقت حاملہ تھی۔ تین بار طیارہ میں سوار کیا۔ لیکن ہر بار اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اور نیچے اترنا پڑا۔ جب سفر کا انتظام مکمل ہو گیا۔ تو فوج ہراتی کو جس کا کچھ حصہ اس وقت قندھار میں تھا۔ حکم ملا کہ ہرات کی طرف کوچ کرے۔ اس موقع پر خوانین اور روسائے شہر اعلیٰحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر ملتمس ہوئے۔ کہ اعلیٰحضرت ان کی وفاداری

اور نیک نیتی پر بھروسہ رکھیں۔ اور یہ کہ وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

شاہ نے شاید موقع کو غنیمت سمجھا، اور ہرات جانے سے رک گیا۔ وہ خوب جانتا تھا۔ کہ قندھار اس کا آخری مورچہ تھا۔ اور اگر یہاں سے ایک انچ دور ہو گیا۔ تو پھر کامیابی ناممکن تھی۔ اور یہ کہ اُسے پھر ہرات نہیں، بلکہ اُس سے بھی دُور کسی غیر ملک میں پناہ لینے کے لئے جانا ہوگا۔ کامیابی کی اگر کوئی صورت بن سکتی تھی، تو وہ صرف قندھار میں رہ کر ہی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اگر لوگوں نے موقع کی نزاکت کو جان لیا۔ اور اپنی ذاتی رنجشوں کو دُور کر دیا۔ اور ایک جان ہو گئے۔ اور قبیلے بھی مدد پر اتر آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی اُس کے قدم نہ چومے۔ اور تخت کابل دوبارہ اُس کے پاؤں تلے نہ ہو۔

دو طیارے آئے سُنا گیا۔ کہ یہ دولت ایران کی جانب سے تھے۔ افواہ گرم تھی۔ کہ دولت ایران نے مدد کی پیش کش کی تھی۔ اور شاہ نے یہ کہہ کر کہ اُسے اُن کی ضرورت نہیں۔ بعد شکریہ ایرانی مہمانوں کو واپس بھیج دیا تھا۔

اس وقت عبدالکریم خان صوبہ قندھار کا گورنر تھا۔ اس کا باپ قاضی سعدالدین امیر عبدالرحمٰن (امان اللہ خان کا دادا) مرحوم کا اعتباری اور وفادار درباری تھا۔ وہ امیر عبدالرحمٰن کے جلاوطنی کے زمانہ میں بھی امیر کے ساتھ ترکستان میں رہا تھا۔ یہ بات عام زبان زد تھی۔ کہ قاضی سعدالدین کا ہی ایک واحد خاندان تھا۔ جو امیر عبدالرحمٰن خان کے زمانے سے آج تک عروج پر چلا آ رہا تھا۔ غالباً یہ متواتر ترقی اس خاندان کی وقت شناسی۔ وفاداری اور اچھی سُوجھ بُوجھ کا ہی نتیجہ تھا۔ اس وقت بھی عبدالکریم خان موقعہ کو غور و خوض اور دور اندیشی کے میزان میں خوب ناپ تول چکا تھا۔ بھانپ گیا تھا۔ کہ اب ان تلوں میں تیل باقی نہ تھا۔ خود ایک ہوشیار قمار باز بھی تھا۔ اور داؤ پیچ بھی ایک پرانا اور رہا ندیدہ کھلاڑی۔ شاہ نے اس کو شُبہ کی نگاہ سے

دیکھا۔ اور اُس کو اعتماد میں نہ لیا۔ عبدالکریم خان نے اسے بظاہر بُرا منایا۔ اور کچھ بے اعتنائی برتی اُدھر لوگ بھی کچھ اِس سے شاکی تھے۔ عبدالکریم خان قدامت پسند اور کچھ سخت گیر تھا۔ عوام سے زیادہ سروکار نہ رکھتا تھا۔ حالانکہ مشہور تھا، کہ ہر قندھاری وزن خود داری میں بیس بیس من کا تھا۔ لوگ اسے مذہب سے بیگانہ جانتے۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ کہ وہ ملکی انتظام میں اچھا منتظم اور فیصلوں میں پورا حق پسند تھا۔ اور وہ کسی کی رو رعایت نہ کرتا۔ وہ جہاں گیا۔ اس کے طفیل امن قائم ہوا۔ اور چوری چکاری اور راہ زنی کا قلع قمع۔ سرداران اور خوانین چور راہزنوں کے پشت و پناہ تھے۔ اس کی مضبوط گرفت سے نہ بچ سکے تھے۔ اس کے علاقے میں امن و خوشحالی سے ہم کنار رہتے۔ وہ اچھا دوست تھا اور خطرناک دشمن۔

ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی کو جو عمر میں صرف گیارہ بارہ سال کا ہو گا۔ قندھار کا گورنر مقرر کر دیا۔ سارا کام عبدالعزیز خان سابق وزیر حربیہ کے سپرد دیکھا۔ عبدالعزیز خان کی تقرری سے لوگ خوش ہو گئے۔ عبدالعزیز خان اس سے پہلے بھی صوبہ قندھار کا گورنر رہ چکا تھا۔ اور لوگوں سے روشناس تھا۔ عبدالکریم خان کو ہزارہ جات میں فوج کی بھرتی کی خاطر بھیج دیا۔ عبدالکریم خان کو میں نے اِس کے بعد ۱۹۲۶ء میں لشپاوند میں دیکھا۔ وہ اپنا ملک چھوڑ آیا تھا۔

عبدالعزیز خان وزیر حربیہ بظاہر ایک کامیاب مامور ثابت نہ ہوا۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔ کہ وہ شاہ کو غزنی کے محاصرہ میں ضروری سامانِ رسد اور جنگ قندھار سے نہ پہنچا سکا۔ وہ کابل میں حبیب اللہ کی سرکوبی میں بھی ناکامیاب رہا تھا۔

کامیابی کی راہ

جب امان اللہ خان کابل سے بھاگ کر قندھار پہنچا تھا۔ تو سنا گیا
کر خزانہ میں کوئی ۳۰ لاکھ روپیہ موجود تھا۔ علاوہ ازیں خود خالی ہاتھ نہ ہوگا
ضرور کابل سے کچھ زر و جواہر ہمراہ لایا ہوگا۔ یا اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ اس نے
کابل سے قندھار روانہ کیا ہوگا۔ امان اللہ خان نے غالباً اپنا ذاتی سرمایہ
محفوظ رکھا۔ بلکہ سنا گیا۔ کہ اس نے قندھار پہنچتے ہی گیارہ لاکھ روپیہ
خزانہ سے نکلوایا۔ اور اپنے ذاتی مستقبل کے استعمال کے لئے ہراتی گارڈ کی
نگرانی میں چمن بھیج دیا۔ لیکن کامیابی کی صورت بنتے دیکھ کر اسے واپس منگوا لیا۔
ہو سکتا ہے۔ شاہ بہ حقیقت دو دلا ہو گیا ہو۔ جیسا کہ ہر انسان ایسے
واقع پہ ایسا ہونے کی طرف مائل رہتا ہے۔ کابل کی تسخیر پہ روپیہ لگانا جوئے
کے کھیل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ناکامیابی کی صورت میں بے سروسامان غریب الوطنی
لازمی تھی۔ اور نیم دلی سے شکست بھی دور نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اگر شاہ
حبیب اللہ کی مانند بھوکا گرگ ہوتا۔ تو جان پر کھیل جاتا۔ اور عجب نہیں کامرانی سے
ہمکنار ہو جاتا۔ لیکن اسے یورپ میں رہنے کے لئے لوازمات میسر تھے۔ اور ان
کی موجودگی اس کی یکسوئی میں حائل تھی۔ اور اسے بزدل بنائے جا رہی تھی۔
ٹھہرانے کو تو قندھاریوں نے شاہ کو ٹھہرا تو لیا۔ لیکن گنتی میں وہی چند سے
معدودے رضاکار رہے۔ جن کو رئیس قندھار عبدالعلی خان نے جمع کر رکھا تھا۔
جواب میں اپنے ان خیموں میں دن کے وقت بیٹھے دھوپ سینکتے رہتے۔ اور ان کے
صحن میں آنے جانے والوں کو واضح طور پر نقلی چوبی مرغابیوں کی طرح دکھائی دیتے۔ فوجی جمعیت

میں قندھاری فوج کی طاقت کے علاوہ پلٹن ہراتی کا کچھ حصہ تھا۔ جس کے ہمراہ پرانی وضع کی ایک دو قاطری توپیں تھیں۔ سُنا کہ توپ خانہ کا افسر عبدالرسول خان تھا اور کمانڈ مشر قوطی خان تھا۔ عبدالرسول خان کو میں ہرات میں گورنر ہرات کے ساتھ شطرنج کھیلتے اکثر دیکھا کرتا۔ اس کے علاوہ کچھ جمعیت قندھاری پولیس کی تھی۔ جو باقاعدہ نظام میں شامل کر لی گئی۔ اس کا کمانڈ مشر محمد لطیف خان کوتوال مقرر ہوا۔

شاہ کے بعض مشیروں نے اُسے سمجھایا۔ کہ وہ مذہبی رنگ اختیار کرے۔ اور اس کا چولا پہنے۔ ورنہ کامیابی محال ہے۔ لوگ اپنے جمود کو نہیں چھوڑیں گے۔ اس مشورہ کو اس طریقہ سے عملی جامہ پہنایا گیا کہ شاہ خرقہ مبارک نکالے۔ کیونکہ اگر شاہ خرقہ مبارک عوام کے عقیدہ کے مطابق باہر لے آنے میں کامیاب ہو گیا۔ تو عوام سمجھ جائیں گے۔ کہ خدا نے شاہ کے گناہ بخش دیئے ہیں۔ یا وہ بے گناہ ہے۔ اور اب اللہ کا مقبول ہے۔ اور اس طرح غلط فہمیاں جو عوام کے دلوں میں گھر کر چکی ہیں۔ دُور ہو جائیں گی۔ اور وہ مدد کے لئے اپنا جمود توڑ کر کمربستہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور نتیجہ خاطر خواہ پیدا ہوا۔ عوام کا ایمان تھا۔ کہ خرقہ مبارک کو ایک گنہگار شخص اٹھا کر باہر نہیں لا سکتا۔ اور یہ کسوٹی تھی۔ جس پر شاہ کے اعمال پرکھے جا سکتے تھے۔ آخر باہمی مشورہ سے خرقہ مبارک کے نکالنے کا دن مقرر ہوا۔ اور یہی خرقہ مبارک دس سال ہوئے۔ ۱۹۱۹ء کے اندر افغان وار میں افغانستان کے صدر اعظم سردار عبدالقدوس خان نے نکالا تھا۔ اور نتیجہ میں ملک افغانستان آزاد ہو گیا تھا۔ خرقہ مبارک ایسے ہی مصائب دور میں ارضی اور سماوی آفات سے نجات حاصل کرنے کے لئے نکالا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک بار سخت قحط کے زمانہ میں نکالا گیا تھا۔ خدا مہربان ہوا تھا۔ اور مخلوق خدا خوشحال۔ اہالی قندھار کا ایمان تھا۔ کہ خرقہ مبارک کے قرب میں توبہ اور استغفار اللہ کی بارگاہ میں مقبول اور مستجاب ہوتی ہے

اور آفات و آلام ارضی ہوں یا سماوی ٹل جاتے ہیں ۔ اور بہبودی کے سامان رونما ہو جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر حکومت ہزاروں روپیہ غربا اور محتاجوں میں خیرات کرتی تھی۔ عوام بے چینی سے اس مبارک دن کا انتظار کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ اس خرقہ مبارک کے تبرکات بابا احمد شاہ درانی بخارا شریف سے ایک سعی بلیغ کے بعد قندھار میں لایا تھا۔ قندھاری لوگ احمد شاہ ابدالی فاتح پانی پت کو بابا کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

یوم خرقہ مبارک

مقررہ دن آگیا۔ مخلصین اور معتقدین اطراف و اکناف سے شہر قندھار میں جمع ہو گئے۔ میں اپنے احباب سمیت عیدگاہ کے میدان میں چلا گیا۔ یہاں ایک وسیع میدان میں زن و مرد، بچے، بوڑھے کھڑے منتظر دیکھے۔ بقرار پروگرام جلوس مبارک گیارہ بجے دن کے احاطہ عیدگاہ میں پہنچنا لازمی تھا۔ خرقہ مبارک عیدگاہ کی چھوٹی سی مسجد کی چھت پر لے جانا مقصود تھا۔ جہاں پر فرش بچھایا گیا تھا۔ اور چھت کے درمیان میں قدرے اونچے پلیٹ فارم پر ایک دفتری میز لگائی گئی تھی۔ شہر قندھار کے شمالی حصہ میں سرکاری ملکی دفاتر کی عمارات کھڑی تھیں۔ جن کو ایک بلند فصیل احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اس احاطہ میں سرکاری دفاتر کے علاوہ صوبہ قندھار کے گورنر کا حرم سرائے بھی بنا ہوا تھا۔ ان جملہ عمارات کو ارگ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس قلعہ نما چاردیواری کا ایک دروازہ بازار شاہ میں کھلتا تھا۔ اور اسے بند کرنے سے یہ احاطہ ایک قلعہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس ارگ کے مغرب میں سڑک کے اس پار ایک وسیع احاطہ تھا۔

جس کو چھوٹی پختہ اینٹ کی چار فٹ اونچی دیوار نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس احاطہ کے وسط میں ایک عمدہ گنبد دار بلا وسط درجہ کی سادہ سی عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس عمارت کے اندر رسولِ اکرمؐ کا موئے مبارک، جُبّہ مبارک اور نعلین مبارک علیحدہ علیحدہ سادہ قسم کے مضبوط اور مقفل چوبی صندوقوں میں بند پڑے تھے۔ اور عوام انہی چیزوں کو خرقہ مبارک کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس احاطہ کے بالکل قریب جانبِ مغرب احمد شاہ درّانی فاتح پانی پت کا بلند گنبد دار مقبرہ کھڑا تھا۔

دو تین سال پہلے اس احاطہ کو امتیازِ خصوصی حاصل تھا۔ مگر اس امتیاز سے شاہ امان اللہ خان نے اس احاطہ کو قانونی طور پر محروم کر دیا تھا۔ یہ احاطہ بست کے نام سے مشہور تھا۔ قدیم سے دستور چلا آیا تھا۔ کہ ملزم یا مجرم یا مقروض یا معتوب جو کوئی مشکل میں پھنسا ہوا اس بست میں پناہ لے لیتا۔ کوئی طاقت اس کو اس کی مرضی کے خلاف اس بست سے نہ نکال سکتی۔ حتیٰ کہ حکومت وقت بھی اُس پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتی۔ اس بست میں جہاں کئی ایک قباحتیں موجود تھیں وہاں فوائد بھی کم نہ تھے۔ بے بس مظلوم بھی اس بست میں امان پاتے۔ یہاں تک کہ کوئی سبیل ان کی بہبودی کی منفعتِ حقیقی بنا دنیا۔ میرے زمانہ میں ایک ہندو مقروض نے اس بست میں آکر پناہ لی تھی۔ اور باوجودیکہ قانونِ وقت اب اُس کا محافظ نہ تھا۔ پھر بھی اُس پر کسی قسم کا جبر نہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ خود ایک روز اپنی رضا و رغبت سے اسے چھوڑ گیا۔

میرے ایک قندھاری ملنے والے نے کہا۔ کہ بارہا دیکھا گیا ہے۔ کہ خرقہ مبارک کی بر آمد نے ان کو مایوس نہیں کیا۔ ہمیشہ مطلوب ملتا ہے۔ خرقہ مبارک کا احاطہ

عیدگاہ سے کوئی تین فرلانگ دُور ہو گا۔ گیارہ بج گئے۔ لیکن خرقہ مبارک کے باہر آنے کے آثار نمودار نہ تھے۔ عوام نے کہنا شروع کر دیا۔ کہ ایک گنہگار اسے باہر لانے میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔ اے خدا! شاہ بے چارہ کی تقصیر دل سے درگزر کر۔ دن کے بارہ بھی بج گئے۔ سب تماشائی بے چین ہو گئے۔ لوگ میدان چھوڑ خرقہ شریف کے احاطہ کی طرف چلنا شروع ہو گئے۔ ساڑھے بارہ بجے ہجوم میں ہیجان پیدا ہوا۔ اور "چار یار" کی دل کو ہلا دینے والی صدا بلند ہوئی۔ قند ھاری لوگ نعرہ تکبیر نہیں لگاتے ان کا نعرہ "چار یار" کا ہے۔ اب تماشائی سڑک کے کنارے رُکنے لگے۔ "یا چار یار" کی کپکپا دینے والی آوازیں پے در پے میدان میں گونجنے لگیں۔ لوگ گڑ گڑائے۔ کوئی آنسو پونچھتا اور کوئی بلند آواز میں خدا سے ملتجی تھا۔ خدایا! شاہ جوال سال پر رحم فرما۔ اکثر خوش تھے۔ کہ شاہ کے گناہ اللہ نے معاف کر دیئے۔ اور اس کی عاجزی قبول ہوئی۔ جوں جوں جلوس قریب آتا گیا۔ تماشائی خاموش ہوتے گئے۔ ہر کس زیر لب کچھ رٹ رہا تھا۔ ایک عجیب انکساری کا سماں تھا۔ لوگوں پر کیف طاری تھا۔ جذباتی فضا ان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔

سست رفتار جلوس میرے قریب آ گیا۔ سب سے آگے درویش لوگ ہاتھوں میں مختلف قسم کے نشان لئے آ رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک مختصر سی جماعت سپاہیوں کی خاکی وردی میں تھی۔ اور اُن کے عقب میں ایک موٹر کار دھیمی رفتار سے آ رہی تھی۔ اس کار میں تبرکات کے بکس رکھے ہوئے تھے۔ کار میں خرقہ مبارک یعنی تبرکات کا متولی امیر امان اللہ خان اور اس کا چھوٹا بہنوئی سردار حسن جان سوار تھے۔ ہر سر کھڑے تھے۔ امیر بند گلے کا سادہ کوٹ اور سر پر عام قرہ قلی ٹوپی پہنے ہوا تھا۔

ٹرک کے دونوں جانب سے لوگ اپنی پگڑیاں، رومال اور کندھے کے دوپٹے کار پر پھینک
رہے تھے۔ اس فعل سے ان کا مطلب کپڑوں کو تبرکات کے بکسوں سے مس دینا تھا۔ کار
کے سوار ان مس خوردہ کپڑوں کو ان کے مالکوں کی طرف واپس پھینک دیتے۔ معلوم ہوا کہ
یہ لوگ ان متبرک کپڑوں کو گھر لے جا کر اپنے عزیز و اقارب میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں
تقسیم کر دیں گے۔ اور یہ ٹکڑے ایک دن ان کے مالکوں کے کفن کا ایک اہم جزو بنیں گے
اور ایک نجات دہندہ ساتھی۔ اس جلوس میں ایک شخص ۳۰ - ۳۵ سالہ جوان بڑا
جوش و خروش دکھا رہا تھا۔ کوئی بولا یہ شخص سید و خان ہے۔ یہ راہزن تھا۔ اس کو شاہ نے
از راہِ بخشش خسروانہ قانونی بازپرس سے آزاد قرار دے دیا ہے۔ شاہ جب قندھار پہنچا
تو اس نے کچھ قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔ ان میں ایک یہ شخص بھی تھا۔

اب جلوس عید گاہ میں داخل ہو گیا۔ مسجد کی چھت پر کی میز پر دو بکس رکھ دیئے
گئے۔ اور میز کے پاس شاہ اور متولی دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے۔ شاہ خاموش
بت بنا کھڑا تھا۔ پیشانی پسینہ سے چمک رہی تھی۔ چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ متولی نے ایک بکس
کھولنا شروع کیا۔ تالا اتارا۔ لوگوں کا شوقِ دید لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا۔ سب کی نظریں
بکس پر جمی ہوئی تھیں۔ بکس کھلا اور متولی نے اندر سے ایک چوغہ (جبہ) نکالا۔ جس کا
اندرون علیحدہ رنگ کا تھا۔ باہر سے رنگ کچھ گہرا سبزی مائل بھورا تھا۔ بوسیدہ نہ تھا۔ جبہ مبارک
کا نظر آنا تھا۔ کہ ہر سمت سے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ کلمہ اور درود شریف کا ورد
زبان پر تھا۔ ہر فرد جو وہاں موجود تھا۔ سکتہ کے عالم میں انکساری میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک
جذبہ کار فرما تھا جس کو روح سے تعلق تھا اور بیان سے باہر تھا۔ ایک ملک کے مطلق العنان
شاہ کی انکساری اور بے بسی اور ایک عام شخص کی عاجزی میں کیا فرق تھا۔ اللہ کے حضور میں

دونو یکساں طور پر بے بس تھے۔ اور اس کی بخشش کے محتاج۔

شاہ کا رنگ فق تھا۔ ہونٹ خشک تھے ساکت کھڑا متولی کی حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اب متولی نے جبۂ مبارک کو چاروں طرف پھیر کر دکھایا۔ اور پھر چند در چند کپڑوں میں لپیٹ کر اسی صندوق میں بند کر دیا۔ دوسرا صندوق جس میں نسابیہ رسولِ اکرم کے نعلین مبارک تھے۔ نہ کھولا گیا۔ بلکہ متولی کے حسبِ ہدایت شاہ نے اس بکس کو دونو ہاتھوں سے اونچا کیا۔ اور اپنے سر پر رکھ لیا۔ پھر اپنا منہ مغرب کی جانب پھیرا۔ اور بکس ابھی سر پر تھا بکس بھاری معلوم دیتا تھا۔

آج ملک کا پادشاہ ایک عام آدمی تھا۔ اس پر روشن ہو گیا۔ کہ معزز وہی ہے۔ جسے خدا نے عزت دے۔ بڑا وہی ہے۔ جس کو اللہ کرے۔ یہ حیات نشیب فراز کی ہے۔ کسی چیز کو قرار نہیں۔ زندگی میں اکڑنے اور شیخی بگھارنے کی گنجائش نہیں۔ ابھی کل کا ذکر ہے۔ وہ پورے ٹھاٹھ شاہانہ میں اور پورے تزک و احتشام خسروانہ سے امیروں اور وزیروں میں گھرا رفقاء سفر کے ساتھ سیاحت اروپا کے شوق میں سرشار اسی قندھار سے تزک و خرم اور مغرور لعد مسرور ہزار ناز برداریوں کے ساتھ رخصت کیا گیا تھا۔ اور اس کے گرد اعلیٰ حضرت اعلیٰ حضرت کی خوش گوئی اور مغرور گونج سدا گونج رہی تھی۔ اور آج اس کی دونوں آنکھیں پرنم تھیں۔ احساس کمتری کے لپیٹ میں تنزل اور بنیادی حقیقت سے دوچار تھا۔ اور اسکا اونچا سر جھکا ہوا تھا۔

اب رسومات سے فارغ ہو کر شاہ چھت کے مشرقی کنارہ پر آ کھڑا ہوا۔ متوقع لوگ کچھ شاہ کے منہ سے سننے کے لیئے اس کی طرف متوجہ ہیئے۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ لیکن لب متحرک نہ ہو سکے۔ آنکھیں دور افق پر گڑھی ہوئی تھیں۔ لبوں کو بار بار زبان سے تر کرتا جاتا۔ لیکن گلے سے آواز بر آمد نہ ہو رہی تھی۔ فصیح و بلیغ امان اللہ کل کے ملک افغانستان کا مطلق العنان پادشاہ جس کا ایک اشارہ قانون کا حکم رکھتا تھا۔ اور یہی خلقِ خدا اس کے رحم و کرم پر زندہ تھی۔ آج اپنے خیالات کو منظم کرنے میں قاصر تھا۔

نطق محال ہو رہا تھا۔ اس وقت مجمع عام میں بلندی پر کھڑا لوگوں کی نظروں کا مرکز بن رہا تھا۔ ورنہ اگر تنہائی میں ہوتا۔ تو شاید پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ یہاں تک کہ اس کا سینہ مایوسی کے بوجھ سے ہلکا پڑ جاتا۔ اور دل سے غم کا غبار اتر جاتا۔ وقت صبر اور تحمل کا تھا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا۔ لیکن زبان پشتو میں نہیں جس کی آج ضرورت تھی۔ کیونکہ اس میں کوشش درکار تھی۔ حاضرین پشتون تھے۔ بلکہ زبان فارسی میں جو کثرت استعمال سے اس کی مادری زبان بن چکی تھی۔ اس کا ترجمہ اب عبدالعزیز خان وزیر تربیہ زبان پشتو میں کرتا جا رہا تھا۔ تقریر کا ما حاصل یہ تھا۔ جس بدبختی نے آج ہم کو گھیر رکھا ہے آپ بھائیوں سے پوشیدہ نہیں۔ میری ملت سادہ تھی۔ گمراہی سے نہ بچ سکی۔ ہمارے دشمنوں نے ہمیں تباہ اور برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ آج یہ عالم ہے کہ متحدہ افغانستان جس کی سرزمین پر مکمل آزادی اور استقلال کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ طوائف الملوکی کا شکار ہو چکا ہے۔ کابل میں ظلم و تشدد کا دور دورہ ہے۔ شرفا کی عزت اور ناموس سے کھیلا جا رہا ہے۔ صوبہ ہرات۔ ترکستان اور سمت جنوبی سے حوصلہ شکن اور پریشان کن خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ آج وقت کا تقاضا ہے۔ کہ آپ لوگ متحد ہو کر اٹھیں۔ اور ایک جان یک جگر ہو کر دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ میں اپنے دشمنوں کے خلاف جہاد چاہتا ہوں۔ جس کی ابتدا ہی تو میں نے فرمائی۔ کہ میرا مطلب ہے کہ حبیب اللہ جیسے بداخلاق شخص کو کابل کے تخت سے دور کر دوں کیا آپ لوگ میرے ساتھ ہیں۔ میں بیتاب ہوں۔ کہ اپنے وطن عزیز کو ایک بار پھر امن و امان اور خوشحالی سے مالا مال کر دوں۔ کیا آپ لوگ میرے ہم خیال اور میرے ساتھ ہیں۔ ہجوم نے مثبت میں بلند آواز میں اقرار کیا۔

فراہمی لشکر

خرقہ مبارک کے نکالے جانے کے بعد تیسرے روز ایک جرمنی منگل اپنے دو تین ہمنشین ساتھی لیکر شاہ کی خدمت میں باریاب ہوا۔ اور درخواست کی کہ انہیں لشکر میں شمولیت کی اجازت

طے۔ جو مقبول ہوئی۔ اس ملنگ کی یہ عرض بھی منظور ہوئی۔ کہ اسے جنگ میں سب سے آگے رکھا جائے اور وہ اپنی جماعت کی کمان بھی خود کرے گا۔ البتہ حکم سرکار کی تعمیل میں سرِ مو فرق نہ آنے پائے گا۔ دلیر ملنگ آغا اشرف تھا۔ وہ خود کو سید بتاتا۔ اسی روز آغا اشرف نے صحن ارگ میں دو خیمے نصب کر لئے۔ جن میں چند ایک سنجیدہ نوجوان جلدی ہی نظر آنے لگے۔ ان میں دو تین چرسی گدڑی پوش ملنگ بھی شامل تھے۔ جن کے چہروں کا رنگ چرس کے کثرت سے پینے سے سیاہ پڑ چکا تھا۔ ان کے ساتھ دو تین کتے بھی تھے۔ ان ملنگوں کے تواروں سے صاف واضح ہوتا۔ کہ انہوں نے اپنی عمریں مزاروں پر چرس نوشی میں گزاری تھیں۔ آغا اشرف خود ایک اونچا لانبا ڈیل ڈول کا مضبوط ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ پاؤں سے ننگا رہتا۔ اور ٹخنوں تک لمبا چوغہ پہنتا سر کے بال لمبے تھے جو اس کے کندھوں پر پڑتے۔ چرس نوشوں والی بھاری بھدی آواز میں گفتگو کرتا۔

آغا اشرف کے بعد دوسرا شخص جو میدان میں آیا۔ وہ سید وخان رانزان تھا۔ اس نے بھی اپنا جھنڈا نصب کیا۔ اور رضاکار بھرتی میں لگ گیا۔ اس کے بعد خیموں کی تعداد بڑھنے لگی میں بھی شفاخانہ ملکی سے جو ارگ کے صحن میں واقع تھا۔ آتا جاتا۔ ان خیموں اور ان کی نفری کو بغور دیکھتا۔ میری خواہش تھی۔ کہ اس تحریک کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو۔ دیکھتے دیکھتے چند ہی دنوں میں ارگ کا نصف صحن خیموں سے بھر گیا۔ اور یہاں اب رنگا رنگ جھنڈے دکھائی دینے لگے۔ قومی دفاتر کھل گئے۔ اس رضاکار عسکر کے لئے مدیر لوازمات مقرر ہوا۔ اور بار برداری کا محکمہ افتتاح میں آیا۔ یہ رضاکار قومی عسکر چند گروہوں میں بٹا تھا۔ ہر گروہ اپنے سردار کے ماتحت تھا۔ سرداران لشکر نے فوجی ضابطہ کی قید و بست سے آزاد رہنا پسند کیا۔ یہ لوگ پیدائشی سپاہی تھے۔ ان کو فوجی ڈرل اور بندوق چلانے کی مشق کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ایسا معلوم دیتا۔ کہ یہ ان سب باتوں سے بے نیاز تھے۔ نہ تو انہوں نے چاند ماری کی۔ وہ نہ دایاں بایاں کیا۔ اور ملنگے بھاگے رضاکار سارا دن بیٹھے دھوپ سینکتے رہتے۔

ماہ مارچ ۱۹۲۹ء کا نصف گزر رہا تھا۔ موسم سرما کی شدت کم ہو رہی تھی۔ کچھ عسکر جمع ہو چکا تھا۔ چنانچہ مقدمۃ الجیش کو ترتیب دی گئی۔ اور اس کو حکم ملا۔ کہ کابل کی طرف پیشقدمی کے لئے تیار ہو جائے۔ اس ہراول فوج کے رضاکار حصہ میں یہ جماعتیں شامل ہوئیں۔ آغا اشرف کی، سید خان کی اور چند ایک قبائلی سرداروں کی۔ نظامی حصہ میں غند ہراتی کے جوان، ایک مختصر بیکہ برائے نام ہراتی توپ خانہ اور قندھاری پولیس کے جوان شامل تھے۔ کل جمعیت میں کوئی چار سو سے کم ہی کار آمد سپاہی ہونگے۔

انہی دنوں میرے بنگالی دوست نواکھلی والے عبید اللہ خان جو افغانستان میں بطور ایک کان شناس کے ملازم ہو کر آئے تھے۔ اور اس وقت بوجہ انقلاب ملازمت افغانی سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ میرے ہمراہ شام کے قریب ہواخوری کے لئے نکلے۔ عبید اللہ خان بھی از راہ شوق اور ہمدردی جمع ہوتے لشکر کا بڑے غور اور انہماک سے مطالعہ کرتے۔ اور محض اس دلچسپی کی خاطر چند یوم کیلئے بیکار ٹھہر گئے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی۔ کہ شاہ کا پلہ بھاری ہو جائے۔ ہم دونو محض ارگ میں خیموں کے پاس سے گزرے۔ اور ان دو تین ملنگ چرسیوں کو بھی دیکھا۔ جو آغا اشرف کے مصاحب تھے۔ اور اس وقت چرس پھونک رہے تھے۔ ان نئے عسکر کی ظاہرہ خامیوں اور خوبیاں پر بھی شوقیہ تنقید کی۔ عبید اللہ خان بولے کہ نسیم لوگ بعض اوقات خلاف امید بڑے معرکے کے کام کر دکھاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک افیمی ملازم کا قصہ سنانے لگے۔ بولے کہ ریاست بھوپال میں وہ ملازم تھے۔ ایک موقع پر نزدیک کے ایک گاؤں سے جو ان کے کیمپ سے قریب تھا۔ کچھ لوگ گھبرائے ہوئے ان کے پاس آئے۔ اور بولے۔ کہ صاحب پاس ہی ایک کھیت میں ایک شیر گاؤں کا بیل کھا رہا ہے۔ اور منت کی۔ کہ اس شیر سے ان کو چھٹکارا دلاؤں۔ عبید اللہ خان نے رائفل سنبھالی اور ان کے ہمراہ ہو لئے۔ شیر گولی کھا کر نزدیک ایک گنوں کے کھیت میں جا گھسا۔ تھوڑی دیر بعد میرے ملازم کے دل میں خدا جانے کیا سمایا۔ وہ منع کرنے پر بھی ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے اس کھیت میں شیر کے پیچھے گھس گیا۔ اس بندہ خدا نے شُنی ان شُنی کر دی۔ بولا اجی ٹھہریئے تو اس بلّے کو ابھی پکڑ کر باہر لاتا ہوں۔ کیا کہے گا کالے خان بھی ڈر کر پیچھے چھپا رہا۔ ہم ناامید ہو گئے۔ اب آپ ہی بتائیے۔ اس کو آپ کیا کہیں گے

دلیری یا حماقت۔ وہ صبح صبح ہانپتا ہوا پسینہ میں لت پت اتفاق سے ایک مُردہ شیر کو باہر گھسیٹے لا رہا تھا۔

بعد میں سنا گیا۔ کہ لڑائی میں آغا اشرف ایک نڈر سپاہی ثابت ہوا۔ گولی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ شاید اسی بے احتیاطی سے غزنی کی لڑائی میں ایک روز دشمن کی گولی سے جاں بحق ہو گیا۔ ہراول کی کمان عبدالاحد خان کو ملی۔ اس سے پہلے وہ کابل میں وزیر خارجہ تھا۔ نادر شاہ کا مصاحب خاص اور اعتبار بھی۔ بظاہر عبدالاحد خان امورِ جنگ سے ایسا ہی کورا تھا۔ جیسے شاہ محمود۔ عبدالاحد خان سپاہی نہ تھا۔ اس کی تمام عمر مصاحبتِ شاہی میں گزری تھی۔ شاہ کا معتمد ضرور تھا۔ شاہ کی خاطر کابل سے ساتھ نکل آیا تھا۔ کوچ سے ایک روز پہلے شہر سے باہر امورینِ دولت کی موجودگی میں اور ہراول لشکر کے روبرو سُنا گیا۔ شاہ نے تقریر کی۔ اس موقع پر ایک سرپھرا وہاں بھی پہنچ گیا۔ ایک درخت پر چڑھ کر مخالفت میں نعرے لگانے لگا۔ آج کا مجمع ہر پہلو سے کامیاب رہا۔ رضاکار قومی لشکر یونیفارم میں نہ تھا۔ سپاہی عام شہری اور دہقانی لباس میں تھے۔ فوجی سپاہی کی وردی بھی مکمل نہ تھی۔

جس روز پہلا لشکر کابل کی طرف روانہ ہوا۔ عسکر کا آخری حصہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے جاتے دیکھا۔ سپاہی لوگ، بے قاعدہ آگے پیچھے اِدھر اُدھر ٹرک پر اور ٹرک کے باہر جا رہے تھے۔ اونٹ اور ٹٹو میلے کچیلے بستروں۔ دیگر سامان اور آٹے کی تھیلیوں سے لدے ہوئے تھے۔ جن میں سیاہ توے اور گھی کی کپیاں نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ شام تاریک ہو چلی تھی۔ آہستہ آہستہ ٹرک خالی ہو گئی۔ سپاہی لوگ ایک دوسرے کے بعد دور پہاڑیوں میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی مائیں، خویش و اقارب اور احباب جو انہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ اب آہستہ آہستہ لوٹنے شروع ہو گئے تھے۔ خدا جانے کون زندہ واپس آئے۔ اس کے چند روز بعد ہی شاہ نے دوسرے عسکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ ارگ کا صحن پھر ایک بار خیموں سے بھر گیا تھا۔ دفتر لوازمات میں خاصی بھیڑ رہتی تھی۔ زین۔ لگام۔ سہدی رقعے اور دیگر لوازمات تقسیم ہو رہے تھے۔ میگزین کا منہ کھلا تھا۔ بندوقیں کارتوس وغیرہ بٹ رہے تھے۔ نئے رضاکار اپنے اپنے جھنڈوں تلے جمع ہو رہے تھے۔ ہندوستانی مہاجروں نے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ اور لے لئے گئے۔ پیر لوگ بھی جلوس کی شکل میں آتے دیکھے گئے۔ ان مجمعوں میں ہُو ہا سنائی دیتا تھا۔

موسم بہار کے ایام تھے۔ جوش و ابھار کے دن۔ دیکھنے والے کے دل میں جنگ کی اُمنگ جنم لیتی۔ فتح کی اُس بندھی تھی۔ حکومتِ اعلیٰ فراہ سے بھی ایک چھوٹا سا کوئی بیس گھوڑوں کا رسالہ پہنچ گیا جو غنیمت تھا۔ رسالہ کا طبل شاہراہ پر بجتا۔ تو مرد و زن اس کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ بچے "چار یار" کا نعرہ بلند کرتے۔ نوجوانوں کے دل جنگ کیلئے گرماتے۔ پائندہ باد اعلیٰحضرت امان اللہ خان غازی کی آوازیں کانوں میں پڑتیں۔

اردو نے بھی کابل کی طرف پیش قدمی کی

منگل کا روز تھا۔ اور ماہ حمل ۱۳۰۸ھ کی چھٹی تاریخ اور مارچ ۱۹۲۹ء کا ۲۶ واں دن یا یوں کہیں شوال ۱۳۴۷ھ کا ۱۴واں دن۔ اسی دن اعلیٰحضرت امان اللہ خان نے بعد دوپہر اپنی سرکردگی میں اور خان و خوانین کی معیت میں دوسرے عسکر کو شہر قندھار سے حرکت دی۔ اور شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر منزل باغ میں پہلا پڑاؤ رکھا۔ یہ دوسرا عسکر کچھ باقاعدہ نظام رضا کار لشکر اور علاقہ فراہ کے کوئی بیس گھوڑے کے رسالہ پر مشتمل تھا۔ توپ خانہ میں کل چار عدد توپیں تھیں۔ جن کو گھوڑے کھینچتے تھے چند سوار رسالہ شاہی کے تھے۔ میرے خیال میں اس فوج میں کوئی چار پانچسو سپاہی ہوں گے۔ اس سے زیادہ نہ ہونگے۔ سچ بات یہ ہے فوج کی شاندار رُعب والی بات میں نے کوئی نہ دیکھی۔ ویسے بھی میں نے اپنے قیام ملازمت میں کابل ہرات اور قندھار میں کسی تقریب پر بھی کوئی فوجی اجتماع کبھی نہ دیکھا۔ البتہ فوجی افسر معمولی تعداد میں دیکھے۔ ان کے سپاہی کبھی بھی بڑی تعداد میں نہ دیکھے۔ اب ان دو عسکروں میں بھی میں نے باقاعدہ نظام سپاہ کی کوئی بڑی تعداد نہ دیکھی۔ زیادہ تر جوان شہری لباس میں دیکھے۔ نہ ہی سارے جوان مسلح تھے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اعلیٰحضرت کس بھروسہ اور برتا پر آگے بڑھے تھے۔ کیا روپیہ کی کمی تھی، اسلحہ کی کمی تھی، یا قندھاری لوگ مدد کرنے میں پیچھے رہے۔ شاہ کے ساتھ اس مہم پر ہزاروں کی تعداد میں تنومند اور جان باز سپاہی ہونے چاہئیں تھے۔ جو اسلحہ سے لدے ہوتے۔ تعداد میں کمی اسلحہ نہ ہونے کے برابر۔ اور پھر کامیابی کی اُمید رکھنا عجیب سا معلوم دیتا تھا۔ اور اسلحہ آتا بھی کہاں سے۔ اور کس راستہ۔ انگریزی ہندوستان کے راستہ آنا ناممکن تھا۔ روس اور ایران کے ساتھ کیسے تعلقات تھے۔ اُن کا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اتنی جلدی

میں اسلحہ کی فراہمی بھی آسان نہ تھی۔ تو کیا اعلیٰ حضرت زیادہ عرصہ انتظار نہ کر سکتے تھے۔ سال دو سال قندھار میں قیام کرتے۔ اور اطمینان سے اچھے پیمانہ پر تیار ہو کر کابل پر چڑھائی کرتے۔ شاہ کو کیوں جلدی تھی۔ جبکہ بظاہر خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ اس کے برعکس کابل میں جدید قسم کا اسلحہ موجود تھا۔ بھاری عمدہ توپیں دشمن کے ہاتھ میں تھیں۔ جن کو بعد میں مَیں نے قندھار میں دیکھا۔ اور ان کا شاندار کام میں نے کافرہ غزنی میں مشاہدہ کیا۔ یہ توپیں ۱۸ پونڈ وزن کا گولہ پھینکتی تھیں۔ اور ہمارے پاس صرف نَو پونڈر تھیں۔

اعلیٰ حضرت کو یہ بھی ضرور معلوم ہوگا۔ کہ کابل اور غزنی کے علاقوں میں عوام اُنکے ساتھ نہیں رہے تھے۔ اور نہ دوبارہ ہوں گے۔ ورنہ کابل سے بھاگ آنے کی وجہ اور کیا تھی۔ ان حالات میں زبردست تیاری کی ضرورت تھی۔ اور یہاں اِس کا وجود نہ تھا۔ دراصل یہ مہم جلد بازی کی اور بے سروسامانی کی مہم تھی۔ اور نتیجہ خلافِ امید نہ نکلا۔ اگر اعلیٰ حضرت کا خیال تھا۔ کہ لوگ اس کی استقامت اور استقلال کو دیکھ کر مرعوب ہو جائیں گے۔ اور ساتھ دینے پر مجبور ہو جائینگے۔ تو یہ خیال بھی موہوم ثابت ہوا۔ میں مانتا ہوں کہ قوتِ عسکری کا میرا تجزیہ نظریاتی تھا۔ جیسا کہ میں تمہید میں ذکر کر آیا ہوں۔ میری کوشش ہمیشہ یہ تھی۔ کہ اس ماحولِ سیاست سے پرے رہوں۔ اور حتی الوسع اپنی لاعلمی کو ظاہر کروں۔ مَیں نے ایسے معاملات پر بات چیت سے اجتناب برتا۔ تاکہ شبہ کی گنجائش ہی پیدا نہ ہو۔ اور میرا دامن خطرات اور مصائب سے محفوظ رہے۔ اور کوئی مصیبت مبادا وبالِ جان بن کر رہ جائے۔ ایک بار تو ایسی ایک مصیبت آتے آتے ٹل گئی۔ بغزنی سے پسپائی پر مقر کے مقام پر گورنر قندھار کے سابقہ میر منشی کو میں صرف ایک بار ملنے گیا۔ یہ صاحب اس وقت فوجی مجلس کے میر منشی کے عہدہ پر فائز تھے۔ بولے ڈاکٹر صاحب ذرا محتاط رہیں۔ یہ جرنیل غلام جیلانی خان سے کوئی کہہ رہا تھا۔ کہ یہاں فوج میں ایک ڈاکٹر ہے۔ وہ بے جا باتیں کرتا ہے۔ جو ہمارے نظامی مفاد کے منافی ہیں۔ اور جرنیل صاحب نے فٹ کہہ دیا تھا۔ کہ ایسے مامور کو قید میں ڈال دو۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ یہ شخص ڈاکٹر نہ تھا۔ لیکن لوگ اُسے ڈاکٹر کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ نظام میں ایک ادنیٰ ملازم تھا۔ اور زبان کا ڈھیلا۔ شاہی افراد میں سردار عنایت اللہ خان۔ سردار حسن جان اور تین چار اور صاحب تھے جو اس پچھلے جیش میں اعلیٰ حضرت کے ہمراہ تھے۔ وزرائے سابقہ میں سے وزیر دربار شاہ غاصی محمد یعقوب خان تھا۔ یہ شاہ کا حقیقی راز دار اور کارگزاری میں اس کا دست راست تھا۔ انتظامیہ میں شاہ کا معین احمد علی خان رئیس تنظیم مقرر تھا۔

یہ بظاہر مستعد۔ ہوشیار اور اچھا کارکن معلوم دیتا تھا۔ سردار احمد علی خان ۱۹۲۳ء میں علاقہ جبل السراج کوہ
دامن میں حاکم تھا۔ اُس زمانہ میں ایک ہندی ہندو ڈاکٹر موہن سنگھ جبل السراج میں متعلق تھا۔ بعد میں اُس کی
تبدیلی فراہ میں ہو گئی۔ جب ۱۹۲۹ء میں جب وہ عازم فراہ تھا۔ تو مجھے قندھار میں اس سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور پھر
ہم دونوں ہم سفر بن گئے۔ میں ہرات میں تعینات ہو کر جا رہا تھا۔ اُس نے مجھے ایک دفعہ بتایا۔ کہ سردار احمد علی خان
بہت غصیل اور بے دھڑک شخص ہے۔ اس نے بتایا۔ کہ ایک روز اس کے روبرو ایک قصاب کو بوجہ گوشت کمی
شکایت پر سردار صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ سردار صاحب کے اشارہ پر ایک ملازم نے گوشت کی ران ٹوکرا
سے اٹھائی اور قصاب کے سر پر دے ماری۔ اور اتنی بار ماری کہ قصاب ادھ مؤا ہو گیا۔ لیکن یہ سلسلہ زدوکوب
کا پھر بھی جاری رہا۔ میں سمجھا کہ قصاب بے چارہ بس ختم ہو گیا۔ قصاب کے لواحقین اسے چارپائی پر ڈال کر
لے گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ علاقہ کے لوگ اس کے نام سے کانپ اٹھتے تھے۔ سردار کا خیال تھا۔ کہ اس علاقہ
کے لوگ اسی طرح قابو میں رہتے تھے۔ نرمی ان کے موافق نہ تھی۔

مجھے مقر کے قریب ایک پڑاؤ پر ایسا ہی ایک منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کچھ قندھاری رضا کار آٹے
کے راشن کو ناقص سمجھ کر لینے سے انکاری تھے۔ یا اُسے ناقص پا کر تبدیلی کے خواستگار تھے۔ بات یہ تھی۔ کہ ان کا
جو راشن جن مل رہا تھا۔ بڑا ناقص تھا۔ اس زمانہ میں اخبار میں پڑھنے میں آتا تھا۔ کہ مصنوعی آٹا ہندوستان میں
بکتا تھا۔ آٹے کی ان دنوں بڑی قلت تھی۔ لکھا تھا۔ کہ یہ آٹا کسی لکڑی کے برادہ سے تیار کیا جاتا تھا۔
میرے سننے میں یہ بھی آیا تھا۔ کہ ایک قندھاری ہندو سوداگر نے کچھ آٹا ہندوستان سے درآمد کیا تھا۔
اور اب یہ آٹا اردو میں تقسیم ہو رہا تھا۔ میں نے اردو بازار سے خود یہ آٹا منگوا کر کھایا تو شکل میں غیر
قدرتی اور کھانے میں بدمزہ تھا۔ سردار صاحب کو رضا کار کی صاف گوئی ناگوار گزری۔ اور اُدھر
آٹا موجود نہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور خود اپنے ہاتھ اور پاؤں سے رضا کار کو پیٹنے لگا۔ اور ساتھ ہی
زبان سے گالی گلوچ کرتا رہا۔ اس سے پہلے سردار صاحب خود اپنے خیمہ میں فرش پر بیٹھا راشن پرمٹ
جاری کر رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت نے جمعہ کے روز ۲۹ مارچ ۱۹۲۹ء کو منزل باغ سے ڈیرہ اٹھایا۔ اور خود مرزا داد

رباط آہنہ میں کیا۔ اور اسی طرح روزانہ اسپ سوار منزلیں مارتا چھٹے روز قلات آپہنچا۔ مقام قلات شہر قندھار سے کوئی اسی میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ راستہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ اور نہ ہی ایسا کوئی گمان تھا۔ کیونکہ قلات تک سڑک کے دونو جانب وفادار درانی لوگ آباد تھے۔ مجھے افسوس تھا۔ کہ میں اس عسکر میں ابتداء سے شامل نہ ہوسکا۔ وجہ یہ ہوئی کہ حالات کو سازگار نہ دیکھ کر ڈاکٹر نظام محمد علی خان جالندھری چند روز کی اتفاقیہ رخصت پر قندھار چھوڑ گیا تھا۔ اور پھر ہندوستان سے واپس نہ لوٹا۔ اور اب میرے سوا علاقہ قندھار میں کوئی سند یافتہ ڈاکٹر موجود نہ تھا۔ میں اگرچہ ڈاکٹر ملکی تھا۔ اور قرار داد ملازمت کے مطابق خدمت نظام سے انکار کرسکتا تھا۔ لیکن ایسا کرنا مصلحتاً درست نہ تھا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ کہ میں بھی ڈاکٹر نظام کی مانند قندھار چھوڑ کر ہندوستان واپس آسکتا تھا۔ اور اس کے لئے مجھے ایک افغان اعلےٰ افسر نے مشورہ بھی دیا تھا۔ اور وہ مجھے راہداری آسانی سے دلا سکتا تھا۔ میں نے اپنے ملک کی نیک نامی کے لئے اس پر خطر اور بے قاعدہ مہم میں شامل ہونے کا تہیہ کرلیا۔ موجودہ نائب الحکومہ مجھے سوائے تنخواہ ماہانہ اور کوئی مراعات دینے پر راضی نہ ہوا۔ اور مجھے اپنے مطالبات منوانے کیلئے کچھ دن لگ گئے۔ آخر کار فرقہ مشر عسکری کی طرف رجوع کیا گیا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ مجھے کنڈک مشر (کرنیل) کے درجہ کا افسر سمجھا جائے۔ اور اسی نسبت سے لوازمات خدمت نظام مہیا کیے جائیں۔ چنانچہ ایک خیمہ اور تین ٹٹو دیئے گئے۔ اپنی خوراک اور اپنے نجی ملازم کی خوراک و پوشش پر میں نے اپنی گرہ سے خرچ کرنا تھا۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کیلئے میں نے تین ماہ کی تنخواہ یکمشت حاصل کی۔ اپنی خوراک میں اردو بازار سے یا قریب کے کسی قریہ سے نقد خرید کرتا۔ اور بعض اوقات یہ اشیاء ملنی مشکل ہو جاتیں۔

میں نے مناسب سامان اور ادویہ فراہم کیں۔ اور ان کی بہت کمی تھی۔ ایک جراح اور تین نفر خدمتی ہمراہ لئے۔ اور منگل کے دن مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء کے روز قندھار سے چل پڑا۔ میری سواری کا ٹٹو اتنا لاغر تھا۔ کہ سفر میں کئی بار مجھے نیچے اتر کر پیدل چلنا ہوتا۔ شام کے قریب ہم سفر کی پہلی رباط آہنہ میں پہنچ چکے تھے۔ میرے ہمراہ میرا نجی ملازم عبدل تھا۔ جو میرے خورد و نوش کا انتظام کرتا۔ خیمہ لگاتا اور اتارتا۔ میرا ملازم قندھاری تھا۔ رباط مرمت کی محتاج تھی۔ کواڑ نہ تھے کمرے کچے اور گنبد دار تھے۔ چاروں طرف پھر کر بڑی مشکل سے ایک کمرہ

رہائش کے قابل پایا۔ جس کا برآمدہ قدرے سلامت تھا۔ یہ رباط باقی دوسری سراؤں کی طرح قلعہ نما تھی۔ اس کے بھی دو حصے تھے۔ ایک مسافروں کے لئے اور دوسرا حیوانات کیلئے کھلا اور بند طویلہ پر دو موسموں کے لئے موزوں۔ رباط کے درمیان میں مسجد تھی۔ برآمدہ میں سامان اُتار دیا۔ ایندھن آٹا اور گھی رباط کے ٹھیکیدار سے قیمتاً حاصل کر لیا گیا۔ رباط کا پانی بدمزہ اور کھارا تھا۔ اگلے روز صبح سات بجے یہاں سے چل پڑا۔ اور دوپہر کے بعد تقریباً تین بجے کے قریب رباط سوم ماتخابیہ پہنچ گیا۔ اس کی شکستہ اور خستہ حالت دیکھ کر دل نہ مانتا۔ کہ اندر جاؤں۔ سُنا کہ یہ رباطیں امیر شہید نے بڑی کوشش اور بصرف زر کثیر بنوائی تھیں۔ اور نئی حالت میں ضرور بڑی عالیشان ہوں گی۔ رباط کیا تھی۔ ایک مضبوط قلعہ تھا۔ جو مسافروں کے آرام اور حفاظت کیلئے بے نظیر ہو گی۔ اُس زمانہ میں ہر رباط میں ایک سرکاری ٹھیکیدار مقرر ہوتا۔ اور حفاظت کے لئے ایک محافظ چوکی۔ ٹھیکیدار حیوانات اور مسافروں کے خورد و نوش کے لوازمات کا ذمہ دار تھا۔ اب یہ رباطیں اپنے حال پہ چھوڑی جا رہی تھیں۔ یہ بلند اور وسیع سرائیں شاہراہ پر پڑاؤ کی شکل میں کوئی کم و بیش پندرہ میل کے فاصلہ پر بنی ہونگی۔ اور اپنے گرد و پیش کے وسیع ویران علاقوں میں کھڑی ہیبتناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ اس رباط کا دروازہ بھی ضائع ہو چکا تھا۔ صحن میں گوبر کا انبار لگا ہوا تھا۔ اکثر کمرے ٹوٹے پھوٹے اور غلیظ تھے۔ اور میانی مسجد میں چند ایک ہزارتی سپاہی ڈیرا جمائے ہوئے تھے۔ جو غالباً حفاظتِ راہ کیلئے مقرر ہونگے۔ تند جھکڑ چل رہا تھا۔ جو ناقابل برداشت تھا۔ تلاش کرنے پر ایک کمرہ ملا۔ اس کو کوڑا کرکٹ سے صاف کیا گیا۔ سرد جھکڑ سے بچنے کیلئے سامان کو کمرہ کے کواڑ دروازے میں چن دیا۔ اس رباط میں شفاخانہ کے دو ملازمین میرے ساتھ مل گئے۔

اگلے علی الصبح سات بجے یہاں سے ہم نے کوچ کیا۔ لیکن سفر کی تکان نے جس کا میں عادی نہ تھا مجھے بہت کچھ ماندہ کر دیا تھا۔ مزید تکان سے بچنے کیلئے کسلو جانے والی کرایہ کی لاری میں بیٹھ گیا۔ یہ میں نے پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ لاریوں کے ڈرائیور عموماً ہندوستانی تھے۔ لاری میں سوار ہو کر میں اگلے رباط پہنچ کر اتر گیا۔ اس رباط کو دیکھ کر طبیعت اور بھی زیادہ پریشان ہوئی۔ دروازہ کے ایک قریبی کمرہ

ایک معزز شخص سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب قوم پوپل زئی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنی قوم کے
لوگ بطور کمک لا رہے تھے۔ اس علاقہ میں بھی جنگ بطوفانی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ ملازم کیلئے کھانا پکانا محال ہو
گیا تھا۔ آج کا راستہ سرسبز تھا۔ سڑک کے دونو طرف سبز کھیتیاں گندمی لہرا رہی تھیں۔ سڑک کے دائیں جانب ساتھ ساتھ ایک
رود بہہ رہا تھا۔ اس کو ترنک کہتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں۔ اور کہیں کہیں خانہ بدوش
خیمے لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے بتایا گیا۔ کہ یہ خانہ بدوش ترکی نسل کے تھے۔ اور گاؤں کے رہنے والے درانی نسل کے
لوگ تھے۔ صبح اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور رباط جلدک ۱۲ بجے وہاں کے پہنچ گیا۔ جب ایک میل اور آگے
نکلا۔ تو اپنا سواری کا ٹٹو خرکار کے سپرد کیا۔ اور خود کرایہ کی موٹر میں سوار ہو گیا۔ کار میں ہندو دکاندار سوار تھے
اور کچھ سامان فروخت کیلئے قلات لے جا رہے تھے۔ شام کو قلات پہنچے یہ معلوم ہوا۔ کہ اعلیٰ حضرت اردو کے
ساتھ ابھی سعد عباں سے آگے بڑھ گئے تھے۔ اور اگلی رباط سرِ اسپ میں ان کا قیام تھا۔ میں قلات میں ٹھہر گیا
شام کو میرا سامان آ پہنچ گیا۔ ٹٹو تھک کر چور ہو چکے تھے۔ رباط کے اندر چند ایک مختصر سی برائے نام دکانیں تھیں۔
سڑک کے بائیں جانب بلندی پر قلعہ تھا۔ رباط کے سامنے ایک تنور والا بیٹھا تھا۔ اور چار پانچ چھاپڑی لگائے ہوئے
تھے۔ سڑک کے دائیں جانب ایک تازہ بنی ہوئی جدید طرز کی پختہ کوٹھی نما عمارت کھڑی تھی۔ جو ڈاک بنگلہ تھا۔ اور اب قلات
کے حاکم کی جائے رہائش اور دفتر تھا۔ ایک کمرہ میں ٹیلیفون نصب تھا۔ اسی جگہ حاکم دربار بھی کرتا تھا۔ کوٹھی کے گرد
ایک خاصا اچھا باغ تھا۔ میں کوٹھی کے اندر گیا۔ حاکم خیر وجان اسوقت دربار کر رہا تھا۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔
سب فرش پر دیواروں کے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ حاکم بالکل سادہ وضع کا پختہ سال آدمی تھا۔ دوپہر کا کھانا اسی کمرہ
میں دسترخوان پر چنا گیا۔ حلوہ تھا، اور نان خمیری۔ سب نے کھایا۔ قلات کے حاکم کی خواہش تھی۔ کہ میں ابھی رہ
ایک پڑاؤ منزل اور مار کر شام اندھیرے اردو میں شامل ہو جاؤں۔ ایسا ممکن نہ تھا۔ لاغر گھوڑے آج ڈیوڑھ
لمبی منزل مار کر تھک چکے تھے۔ اور خرکار وہاں کا مالک نہاں تھا جو اس کے علاوہ شفاخانہ کے ملازم باوردیہ
ابھی بہت پیچھے آ رہے تھے۔

میں ۵ اپریل ۱۹۲۹ء (۱۶ برج حمل) کو قلات میں پہنچا تھا۔ اگلا دن بھی اسی جگہ گزرا۔ سردی ابھی
کافی تھی۔ جس وقت ہوا چلتی تو سردی برداشت نہ ہوتی۔ ۷ اپریل کے دن شفاخانہ کا عملہ پہنچ

گیا۔ ادھر اعلیٰ حضرت اردو بمعیت قلات سے آگے تیسرے پڑاؤ پر پہنچ چکا تھا۔ شفاخانہ کے ملازمین ایک دو دن قلات میں ستستانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۰ اپریل کا دن بھی قلات میں گزر گیا۔ اسی دن دوپہر کو میں اول بار میں اوپر قلعہ میں نہانے گیا۔ میرے ملازم نے مجھے بتایا تھا۔ کہ قلعہ میں گرم پانی کا ایک چشمہ تھا۔ قلعہ ایک قدرتی اونچے ٹیلا پر بنا ہوا تھا۔ یہ ٹیلا ترک کے بائیں جانب ایک آدھ فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ اسی ترک کے دائیں طرف ذرا آگے کو ہٹ کر اسی قدوقامت کا ایک اور بڑا ٹیلا تھا جس کی اوپر کی سطح ہموار دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس پر کوئی آبادی نہ تھی۔ غالباً اس پر پانی نہ تھا۔ ورنہ دو قلعے یہاں پر نہایت موزوں اور دلفریب معلوم دیتے۔ ایسا معلوم دیتا گویا قدرت نے ان دو ٹیلوں کو ترک کی حفاظت کیلئے بنایا ہے۔ قلعہ والے ٹیلا پر ایک بزرگ کا مزار بھی تھا۔ اور یہ چشمہ سے بالکل ملحق تھا۔ مگر ذرا اونچائی پر۔ ایسا معلوم دیتا۔ کہ یہ چشمہ اس مزار کے نیچے سے پھوٹ رہا تھا۔ جیسا کہ ہر مزار پر افغانستان میں ایک جھنڈا ضرور ہوتا ہے۔ اس مزار پر بھی سرخ رنگ کا ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور معتقدین نے کئی ایک چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں مزار کے ٹیلا پر گاڑ رکھی تھیں۔ جو غالباً مانگی منتوں کے متعلق ہونگی۔ چشمہ سے گرم پانی کافی مقدار میں خارج ہو رہا تھا۔ رواں پانی کی دھار پر دو غسل خانے بنے ہوئے تھے۔ جن میں پردہ میں غسل ہو سکتا تھا۔ قلعہ ایک ٹوٹے پھوٹے چند کچے کمروں کا اب مجموعہ تھا۔ نہ ہی وہاں کوئی متنفس میری نظر پڑا۔ اور نہ ہی کوئی جانور دیکھا۔ کسی وقت یہ آباد اور پر رونق جگہ ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے علاقہ کا حاکم پہلے یہاں ہی رہتا ہو۔ اور حفاظت کے لئے ایک چوکی بھی یہاں موجود ہو۔ لیکن اب تو کھنڈر ہی بن چکا تھا۔ البتہ قلعہ کی کچی فصیل اب بھی کم مضبوط نہ تھی۔ واپسی پر دریائے ترنک کے کنارہ پر دو تین گھر دیکھے۔ یہ کوئی قریہ ہوگا۔ قلات میں اس قیام کے دوران میں معلوم ہوا۔ کہ قلات میں ہمارے مقدمۃ الجیش کی معمولی جھڑپ قلات کے سوری قبیلہ کے لوگوں سے ہوئی۔ اسمیں سوری لوگ شکست کھا کر دور اپنے پہاڑی علاقہ ترنک پار میں جا چھپے تھے۔ (کیا شیر شاہ سوری اسی ہی قبیلہ کا فرد تھا۔) یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ حبیب اللہ کے ایک فوجی افسر کی سرکردگی میں یہ لوگ جمع ہوئے تھے۔ قلات سے آگے اب ہر جگہ خطرہ ہی خطرہ تھا۔ یہاں سے غلزئی آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ اور غلزئی قوم حبیب اللہ کی وفادار نہ رہے تھے۔ قدرتی طور پر غلزئی اور غیر غلزئی کا قدیم سوال بھی تھا۔ شاہی خاندان غیر غلزئی محمد زئی نسل تھا۔ عام طور پر سنا جاتا کہ رباط آسوجان پر بہت خطرہ درپیش تھا۔ لیکن یہاں پر بھی معمولی چپقلش ہوئی۔ اور میدان صاف ہو گیا۔ شاید ترکی لوگ مخالف تھے۔ اور توخی لوگ ان میں شامل نہ ہوئے تھے۔

میری اردو میں شمولیت:۔ عسکر میں جلدی شامل ہونے کی غرض سے میں نے

شفاخانہ کے عملہ کو قلات میں چھوڑا۔ اور خود ایک کرایہ کی لاری میں بیٹھ کر ۹ر اپریل یعنی ۲۰ برج حمل کے دن قلات سے چل پڑا۔ تدریج رباط سراسپ۔ تازی۔ شاہ جوت گزر کر رباط اتوجان میں پہنچ گیا۔ یہاں لب جو بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ قلات سے آگے سارا علاقہ دشمن کا تھا۔ راستہ میں نئے رضاکار جتھے ملے۔ ایک جگہ ان سپاہیوں نے لاری روکنے کو کہا۔ اور آگے جانے سے منع کیا۔ انہوں نے دور پہاڑیوں میں کچھ مشتبہ لوگ دیکھے تھے۔ کھانا سے فارغ ہو کر تو پھر لاری مقر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اب صرف اگلی رباط مقر تھی۔ ہراول اور اردو میں صرف ایک رباط کا فاصلہ درمیان میں رکھنے کا حکم تھا۔ یعنی ہراول عسکر صرف ایک پڑاؤ اردو سے آگے رہتا تھا۔ اور عبدالاحد خان کے زیر کمان تھا۔ میں ۹ر اپریل بروز منگل وار کو بعد دوپہر تقریباً ڈھائی بجے مقر پہنچ گیا۔ اس روز حمل کی ۲۰ تاریخ تھی۔ یہاں پہلی بار اردو میں شامل ہو گیا۔ یہ رباط دوسری رباطوں سے بڑی تھی۔ اور نسبتاً بہتر حالت میں تھی۔ اندر صحن میں سے کاریز کا پانی گزرتا تھا۔ قریب ہی ایک جدید طرز کی نفیس مگر چھوٹی سہ منزلہ عمارت بنی ہوئی تھی۔ انقلاب سے پہلے خصوصی مسافروں اور سرکاری مہمانوں کے ریسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال میں آتی تھی۔ ایک قسم کا ڈاک بنگلہ تھا۔ آج خود اعلیٰ حضرت اس میں قیام پذیر تھا۔ لوگ ابھی خیمے لگانے سے بالکل فارغ نہ ہوئے تھے۔

مجھے فوجی طبیب حبیب اللہ خاں اپنے خیمہ میں لے گیا۔ اور بتایا کہ یہ رباط دو تین دن پہلے امیر حبیب اللہ بچہ سقاؤ کے آدمیوں کے قبضہ میں تھی۔ اگر مردمان ہزارہ جات حکمت عملی اور ہمت سے کام نہ لیتے تو اس رباط میں آج ہمارا داخلہ مشکل تھا۔ سخت خونریزی ہوتی۔ شام کے قریب اسی طبیب نظامی کے ہمراہ میں رباط دیکھنے گیا۔ یہاں غریب ہزارہ لوگ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بستیوں کی تعداد میں

ٹھہرے ہوئے دیکھے۔ بہت پاؤں سے ننگے تھے۔ جو شخص ان کو خدمت کیلئے ان کے اپنے وطن سے اکٹھا کر کے لایا تھا۔ وہ سید اکبر علی قندھاری تھا۔ اور قندھار کے ایک باعزت شیعہ گھرانے کا رکن تھا۔ اہل ہزارہ بھی شیعہ اعتقاد کے لوگ ہیں۔ شکل و صورت میں گورکھا معلوم دیتے ہیں۔ ملک میں عام طور پر ان سے ادنیٰ کام لئے جاتے ہیں۔ ان کے کوہ بند دشوار گزار علاقہ کو امیر عبدالرحمٰن خاں نے فتح کیا تھا۔ اور بڑی تعداد میں مرد و زن کو غلام بنا لیا تھا۔ اور امیر امان اللہ خان کے عہد سے پہلے اس علاقہ کے لوگ بطور غلام فروخت ہوتے رہے۔

سید اکبر علی اس وقت سر کے بال منڈوا رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ کہ یہ رباط امیر حبیب اللہ کے قبضہ میں تھا۔ رات کی تاریکی میں ہزارہ لوگ رباط کے گرد چھپ کر بیٹھ گئے۔ متغر کا ارباب فتح محمد خان ان کے ساتھ مل گیا۔ اور وہ امیر حبیب اللہ کے فوجی افسر کا بھی معتمد تھا۔ اس نے دروازہ پر رازدارانہ انداز میں دستک دی۔ سوال و جواب کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ ہزارہ لوگ یکدم ہلہ بول کر اندر گھس گئے۔ اور رباط پر قبضہ کر لیا۔ ان ہزارہ جوانوں میں کچھ ایسے بھی تھے۔ جو ہندوستان کے انگریزی نظام میں کچھ عرصہ کیلئے بطور سپاہی خدمت انجام دے چکے تھے۔ اور زبان ہندوستانی میں بخوبی بات کر سکتے تھے۔ متغر میں زیادہ تر علی خیل قبیلہ کے لوگ آباد تھے۔ جس ملک نے رباط کی فتح میں حصہ لیا تھا۔ شاہ نے اس کو میرے پاس آنکھوں کے علاج کے لئے بھیجا۔ اب وہ علاقہ متغر کا حاکم بنا دیا گیا تھا۔ یہ اس کی خدمات کا صلہ تھا۔ اعلیٰ حضرت اس کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر پُر رونق ہو گیا تھا۔ اور اس سے شاہی جلال عیاں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ اعلیٰ حضرت خاکی وردی نما لباس زیب تن کئے عمارت ریشمارنٹ کی تیسری منزل میں کرسی پر بیٹھا ملاف نظر آتا تھا۔ نیچے عمارت کے پاس میدان میں کچھ ہزارہ لوگ ڈھول کی چوٹ پر قومی رقص میں مو تھے۔ شام بڑی پُر رونق تھی۔ اور ہر طرف گہما گہمی تھی۔ اور خوش گپیاں اڑ رہی تھیں۔ سب کے حوصلے بلند

پر تھے۔ افواہ تھی۔ کہ مقام مقر کی طرح ہزارہ لوگوں نے ہمت کر کے شہر غزنی بھی فتح کر لیا ہے۔ امیر حبیب اللہ کے
جو سپاہی رباط مقر کی فتح کے بعد ہمارے ہاتھ آئے تھے۔ ان کو اعلیٰ حضرت نے آزاد کر دیا تھا۔ اس شرط پر
کہ وہ دوبارہ دشمن کی صفوں میں شامل نہ ہونگے۔ بلکہ اپنے ہم وطن کوہستانیوں کو سمجھائیں گے۔ کہ اب بھی ان کے
قصوروں اور خطاؤں سے درگزر کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت تیار ہے۔ سمت شمالی کوہستان کا وہی علاقہ ہے۔
جہاں کا رہنے والا امیر حبیب اللہ تھا۔ اور اب کابل کی حکومت انہی کے قبضہ میں آچکی تھی۔ جو سپاہی علاقہ غزنی
میں رہنے والے تھے۔ ان کو نہ چھوڑا۔ بلکہ ان کو یقین دلایا۔ کہ جب غزنی سے معذرت نامے موصول ہونگے۔
تو اس وقت ان کو بھی رہا کر دیا جائے گا۔ رباط کی کوہستانی جمیعت کے سردار فوجی افسر کو گولی مار کر ہلاک کر
دیا گیا۔ سنا گیا کہ یہ شخص اس سے پہلے ایک مکتب کا مدرس تھا۔ اور علاقہ کوہستان میں انقلاب سے پہلے
پڑھاتا تھا۔

خیال تھا۔ کہ اردو مقام مقر میں کم از کم ایک ہفتہ قیام رکھے گا۔ لیکن خلاف توقع ۱۱ اپریل کو صبح ہی
کوچ شروع ہو گیا۔ مقر میں اس کاریز کا پانی جو گاؤں کی آبادی کے پاس سے گزرتی تھی اچھا تھا۔ یہاں کی
زمین زیر کاشت تھی۔ اور اس کے سرے پر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ یہ جگہ بھی ابھی ٹھنڈی تھی۔ سخت جھکڑ چلنا
جو خیموں کو اکھاڑ دیتا۔ کوچ اس ترتیب سے ہوا۔ سب سے پہلے رسالہ نکلا۔ اس کے پیچھے گھوڑوں پر اعلیٰ حضرت
اور اس کے ہمرکاب خوانین تھے۔ پھر پیادہ عسکر اس کے دنبال میں باربرداری اور سب کے عقب میں پھر ایک مختصر
سا رسالہ جس کو رسالہ دمچی کہتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت خود گھوڑے پر سفر کرتا تھا۔ اس کی اپنی موٹر کار خالی ساتھ رہتی
اس کا ڈرائیور ہندوستانی تھا۔ بعد دوپہر دیگھے پڑاو پر پہنچ گئے۔ اس پڑاو کا نام اوبے تھا۔ اور دوسرا نام
لڑم تھا۔ افغانی میں لڑم بچھو کو کہتے ہیں۔ اور آو بہ پانی کو۔ پانی یہاں اچھا تھا اور رواں۔ ہم اصل رباط سے

دو دو میل آگے جا ٹھہرے۔ یہ مقام محفوظ تھا۔ ریت کے قدرتی چار ٹیلوں کے درمیان میں ڈیرے جمائے۔ ال
ٹیلوں پر جو چاروں کونوں پر تھے۔ توپیں چڑھا دی گئیں۔ راستہ میں امن رہا۔ کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ الز
ادبے کا گاؤں خالی تھا۔ اس کا مطلب تھا۔ کہ لوگ ہمارے دشمن تھے۔ کئی ساکنین دیہہ اپنے گھروں کے بن
کواڑوں پر بچاؤ کے خیال سے کلام الہٰی لٹکا گئے تھے۔ ایک دو سفید ریش منت سماجت کے لئے موجود تھے۔
وہ موٹر کار بھی دیکھی۔ جس پر سوار ہو کر اعلےٰ حضرت کابل سے قندھار کی طرف فرار ہوا تھا۔ اور جو یہاں
پر خراب ہو کر رہ گئی تھی۔

ہوا تند اور تیز تھی۔ خیمے کھڑے کرنے محال ہو گئے۔ احکام کو جارچی یعنی ڈھنڈورچی سامنے اور درمیا
پھر کر زبانی سنا دیتا تھا۔ شام کو سونے سے پہلے کوچ کے وقت کا اعلان سنا۔ جارچی نے خبرداری سے
رات گزارنے کی تاکید کی۔ کہ دشمن سے خطرہ ہے۔ شب امن سے گزر گئی ۱۲ اپریل کو صبح ۷ بجے کوچ
ہوا۔ اور دوپہر کے قریب رباط گوائیں میں قیام ہوا۔ سنا تھا۔ اس پڑاؤ میں دشمن مقابلہ میں آئے گا۔
لیکن مدافعت نہ ہوئی۔ البتہ گاؤں خالی پایا۔

قرہ باغ میں چائے ملی:- ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو صبح کوچ ہوا۔ جس رباط کو ہم پیچھے چھوڑ
شاید اس میں خاطر خواہ حفاظتی چوکی نہ بناتے۔ بشاید ہم اپنے عقب سے لاپرواہ ہو کر آگے بڑھے جاتے تھے۔
غالباً ایسی چوکیوں کے لئے وافر سپاہی نہ تھے۔ ایسا معلوم دیتا تھا۔ کہ پنجابی مثل "اگا ہورتے پچھا چوڑ"
ہم پر مصداق آتی تھی۔ افسران بے خبر نہ تھے۔ کہ علاقہ تمام دشمن کا تھا۔ اور ہم ٹرک کی حفاظت
کا مناسب انتظام کئے بغیر آگے بڑھے جا رہے تھے۔ آج راستہ میں قرہ باغ کے مقام شیر محمد خان
ایک معزز رئیس نے اعلےٰ حضرت کے اعزاز میں چائے ناشتہ کا انتظام کیا تھا۔ چونکہ میں پیچھے تھا۔

بنا تفصیل نہیں بتا سکتا۔ ذرا دور سے البتہ ٹرک کے ایک جانب شامیانہ میں نے لگا دیکھا۔ آج میں نے یہاں ٹرک کے کنارہ پہ اونچے لمبے چار بوڑھے سکھوں کو کھڑا دیکھا۔ یہ اعلیٰ حضرت کو دیکھنے آئے تھے۔ پوچھنے پر بتایا کہ وہ شیخ آباد کے رہنے والے تھے۔ اور وہ گاؤں نزدیک ہی تھا۔ سکھ لوگ اپنے مخصوص لباس سرخ اور زرد میں نمایاں تھے۔ اس مقام پر میں نے ہزارہ لوگوں کی ایک صف دیکھی۔ جس میں کوئی بیس نفر ہوں گے۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ سب رضاکار تھے۔ یہ لوگ سب کے سب بے ہتھیار تھے۔ ایک دو کے پاس کلہاڑیاں اور زنگ آلود بندوقیں تھیں۔ اور بس۔ دوپہر کے وقت رباط مشکی پہنچے۔ گاؤں سے باہر ریتیلے میدان میں کیمپ لگا۔ شب امن میں گزر گئی۔ گاؤں خالی تھا۔ صبح ۱۴ اپریل کو یہاں سے چل پڑے۔ اور دوپہر کو رباط ثانی پہنچ گئے۔ یہاں سے غزنی دس پندرہ میل صرف رہ گیا تھا۔ سنا گیا۔ کہ شام کو قندھار سے کچھ اور کمک پہنچ گئی تھی۔

ہمارا ہراول اب غزنی سے باہر تیار کھڑا تھا۔ آج شام اعلیٰ حضرت نے پہلی بار عسکر کا معائنہ کیا۔ آج شفاخانہ کے ملازم نے جو پیچھے رہ گیا تھا۔ بتایا۔ کہ پچھلی رباط میں دشمن نے ہماری کمک پر یلغار بول دی تھی۔ یہ حملہ آور لوگ۔ رباط کے نواح میں رہنے والے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارے لوگ رباط کے قریب پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے رباط کے اندر سے حملہ آوروں کا خوب منہ توڑ جواب دیا۔ حملہ آور پسپا ہو گئے۔ ہمارا کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ اس کمک کے بعد اور کوئی کمک قندھار کی طرف سے ہم تک نہ پہنچ سکی۔

راہ محفوظ نہ رہ سکا۔ جب ہم رباط ثانی کی طرف آ رہے تھے۔ تو راستہ میں ایک موٹر کار کھڑی دیکھی۔ موٹر کے پاس دو ہندو قندھاری دوکاندار کھڑے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ دوکاندار قندھار سے کمانڈر ہراول کے لئے لا رہے تھے۔ لوگوں نے ان کا مال کار روک کر لوٹ لیا تھا۔ خود اعلیٰ حضرت نے ان دوکانداروں کو اس حالت میں دیکھا۔ آج سنا گیا۔ کہ عبدالاحد خان نے غزنی پر حملہ کرنے کی اجازت

طلب کی۔ اس نے کہلا بھیجا تھا۔ کہ غزنی میں اس وقت دشمن کی طاقت کم ہے۔ اور کل تک مزید کمک دشمن کو پہنچ رہی ہے۔ اگر تاخیر ہوئی تو غزنی کی تسخیر مشکل ہو جائے گی۔ اعلیٰ حضرت نے اجازت دے دی۔ اعلیٰ حضرت کا خیال تھا۔ شاید شہر غزنی کے لوگ شہر کا دروازہ کسی طرح اس کے لئے بغیر لڑائی کھول دینگے اور خونریزی سے بچ جائیں گے۔

غزنی کی طرف پیش قدمی :-

پندرہ اپریل مطابق ۲۶ ماہ حمل کو صبح غزنی کی طرف ہم نے پیش قدمی کی۔ جب حصار غزنی دکھنے لگا۔ تو پانچ میل دور سے ہی ٹرک کو چھوڑ کر ہم نے دائیں جانب رُخ کیا۔ غالباً اس خیال سے کہ شہر غزنی پر دو سمت سے حملہ کیا جائے۔ کیونکہ ٹرک کے بائیں جانب غزنی کے قریب ہمارا ہراول عسکر ڈیرہ ڈالے تھا۔ آج ہمارے ساتھ آٹھ دس کاریں اور لاریاں تھیں۔ کچھ میں گولہ بارود اور ایک میں خزانہ تھا۔ دو بڑی جرمنی بسوں میں سفید ریش اور خوانین سوار تھے۔ ان میں بعض گھوڑے کی سواری کے بوجہ سن ناقابل تھے جہاں ٹرک پر غزنی سے پانچ میل ورے گولہ بارود اور خزانہ ٹٹوؤں اور گدھوں پر لاد دیا گیا۔ جو موٹریں خالی ہوئیں۔ ان کو حکم ہوا کہ وہ ایک رباطی قلعہ میں جو ٹرک کے قریب تھا وہاں چلی جائیں۔ اس قلعہ میں وہ دو جرمن بسیں بھی گئیں۔ جن میں خوانین سوار تھے۔ اردو والا غزنی کو عبور کر کے آگے نکل گیا۔ اور لوگر کو جانے والی ٹرک پر خیمہ زن ہو گیا۔ اب شہر غزنی کے سامنے دائیں بائیں ہمارے دونوں عساکر ڈیرے ڈالے موجود تھے۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے تھوڑی دیر بعد حصار غزنی سے توپیں چلنے لگیں۔ جلدی ہی ایک جانب سے بادل اٹھا۔ اور تاریکی چھا گئی۔ ابھی خیمے پورے طور پر نصب نہ ہونے پائے تھے۔ کہ بادو باراں کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ خیمے اڑنے لگے بشگون اچھا نہ تھا۔ کیا قدرت کو ہماری کامیابی مطلوب نہ تھی۔

یا اشارہ تھا۔ کہ یہ جگہ اردو کے مقام کے لئے موزوں نہ تھی۔

ہم ایک سلسلہ کوہ کی دیوار کے پیچھے خیمہ زن تھے۔ ہمارے بائیں جانب دور شہر غزنی اور اس کی فصیل کے اندر بہت بلندی پر غزنی کا قلعہ تھا۔ ہمارے عقب میں سڑک لوگر کو جاتی تھی۔ اور اس کے عقب میں رودِ غزنی بہتی تھی۔ دائیں طرف اور پیچھے ایک وسیع میدان تھا۔ قریب کی بائیں پہاڑی پر چڑھ کر ایک ساتھی سے دوربین لے کر میں نے بھی شہر غزنی اور حصارِ غزنی غور سے دیکھا۔ سامنے شہر غزنی ایک ٹیلہ پر آباد معلوم دیتا تھا۔ ڈھلوان پر رہائشی مکانات بنے ہوئے تھے۔ اور چوٹی پر قلعہ تھا۔ ان سب کو بڑی فصیل احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اس پہاڑی پر مجھے بتایا گیا۔ بہلول دانا کا مزار تھا۔ اور شاید محمود غزنوی کا بھی سامنے اور بائیں جانب اردو کے پہاڑی چوٹیوں پر اب ہمارے نگہبان جوان متعین تھے۔ رات اپنے ساتھ قدرتی سکون لائی۔ لیکن پہاڑیوں پر سے کبھی کبھی گولے چلنے کی آواز آجاتی۔ اور نیند میں خلل ہوتی۔

سولہ اپریل کا دن

۱۶؍ اپریل کا دن چڑھا۔ نماز فجر کے لئے ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ فضا میں ہمارے خیموں پر سے برائی آتش بازی کی ہوائیوں کے گزرنے جیسی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ جن کو میں سمجھ نہ سکا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ دشمن کی توپیں ہم پر گولے برسا رہی تھیں۔ اور یہ سرسراہٹ ہوا میں گولوں کے گزرنے کی تھی۔ لیکن ہمارے درمیان شاید کوئی گولہ نہ پھٹا۔ اور نہ ہی کوئی جانی یا مالی نقصان ہوا۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا۔ ہمارے عسکر کی مصروفیت بڑھتی گئی۔ توپیں پہاڑی پر چڑھا دی گئیں۔ اور دو توپیں عین میرے خیمہ کے پاس آکر رک گئیں۔ ان کا رخ رودِ غزنی کی طرف کر دیا گیا تھا۔ اور چند ہی لمحوں میں سردار حسن جان کے اشارہ پر گولے برسانے لگیں۔ میں پاس کھڑا بے خوف سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سردار صاحب کے ہاتھ میں دوربین تھی۔ لیکن بہت بلندی پر یہ

تو ہیں خاموش ہو گئیں۔ مشتبہ لوگ خود ہمارے اپنے رضا کار سپاہی تھے۔ جو آٹا کی خریداری کے لئے یا گھوڑے کے لئے پاس کسی گاؤں میں چلے گئے تھے۔ ایسی غلطی بعد میں بھی ایک دو بار ہوئی۔

اردو میں خیمے کسی خاص نقشہ کے مطابق نہ لگائے جاتے۔ اور نہ ہی شفاخانہ کے لئے کوئی جگہ مقرر کی جاتی جہاں موقع ملتا۔ ہم اپنا خیمہ نصب کر دیتے۔ آج میرا خیمہ سب سے آخر میں بالکل لب سڑک تھا۔ اور بالکل غیر محفوظ۔ بلکہ ایک طرح سے بالکل اکیلا۔ آج دو جانب سے شہر غزنی پر حملہ کیا گیا۔ حملہ جاری تھا۔ اور دن کے بارہ بج گئے تھے۔ ہر لمحہ فتح کی خبر سننے کیلئے ہم بے تاب تھے۔ آغا اشرف کے دستہ کا ایک درویش شاید کچھ پیغام لے کر آیا۔ اعلےٰ حضرت اس وقت میرے قریب ہی پہاڑی پر کھڑا دوربین سے غزنی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ درویش مجاہد بہت دیر تک اعلےٰ حضرت سے باتیں کرتا رہا۔ پھر یہ درویش واپس غزنی کی سمت چلا گیا۔ سنا گیا۔ کہ شام تک ہمارا ہراول عسکر شہر غزنی میں داخل ہو جائیگا۔ چنانچہ اس نیک ساعت کی انتظار ہونے لگی۔

ہوائی حملہ:۔ ۱۶ اپریل دوپہر کے دو بجے ہونگے۔ کابل کی سمت سے دو طیارے پرواز کرتے ہوئے نظر آئے۔ یہ کہنا مشکل نہ تھا۔ کہ طیارے دشمن کے تھے۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی طیارہ نہ تھا پہلے ہمارے ہراول پر گھومے پھر ہمارے کیمپ کی طرف رخ کیا۔ جو آگے تھا۔ اس نے چھ بمب گرائے۔ یہ ہمارے کیمپ کے نزدیک میدان میں گرے۔ کوئی نقصان نہ ہوا۔ دیکھا گیا ایسے موقع پر کوئی شخص احتیاط نہ برتتا۔ بے خوف اپنے کام میں لگا رہتا۔ جیسے طیارہ کا وجود وہاں تھا ہی نہیں۔ بعض سوچتے کہ طیارہ والوں نے شاید دانستہ بم ہم سے دور پھینکے تھے۔ البتہ ہوائی حملہ کا خوف غالب آیا۔ پچھلا طیارہ نزدیک اگر بہت نیچے اتر آیا تھا۔ اس سے کوئی بم نہ گرا۔ طیارہ پر زمین سے کوئی گولی نہ چلائی گئی گولی چلانے کا حکم:

تھا۔ اعلیٰ حضرت پہاڑی پر کھڑا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا۔ اور طیارہ کی سمت تین چار بار اسے ہلایا۔ غالباً یہ ایک قسم کا شکریہ ہوگا۔ یا آئندہ کے لئے درخواست ہوگی۔ کہ آئندہ بھی وہ نقصان نہ کریں۔ آج درحقیقت طیارہ ران نے نرمی نہ برتی تھی۔ اس کا نشانہ خطا گیا تھا۔ آئندہ کے لئے شاہ کا رومال ہلانا بے اثر نہ رہا۔ جیسا کہ بعد میں مجھے ایک طیارہ ران نے قندھار میں فخریہ بتایا۔ کہ بمب برسانے سے ہر کوئی طیارہ ران گھبراتا تھا۔ کابل میں اس نے اپنی خدمات اس فعل کے لئے پیش کی تھیں۔ اور اس نے ہی اڑ کر محل باغوری میں اور پر بمب برسائے تھے۔ اور یہاں نقصان بھی ہوا تھا۔ اگر آج طیارہ ران نے شاہ کو رومال ہلاتے دیکھ کر پہچان لیا ہوگا۔ تو اس نے مزید اپنے دوسرے طیارہ رانوں سے اس کا ذکر کیا ہوگا۔

شام ہو گئی تھی۔ لیکن شہر غزنی سر نہ ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا۔ قندھار سے رخصت ہوتے وقت مجھے ایک ہندوستانی دوست نے کہا تھا۔ مبادا ایسا سمجھنا کہ ہوائی پر جا رہے ہو۔ یاد رہے شدید معرکے ہوں گے۔ جو کہتے تھا۔ اب تو بالکل ایسا ہی نظر آرہا تھا۔ کامیابی آسان نظر نہ پڑتی۔ ابھی تو لڑائی کا آغاز تھا۔ آج کا دن کامیاب ثابت نہ ہوا۔ بلکہ محصور کنندہ محصور ہو رہا تھا۔ میں شام ہونے سے ذرا پہلے دوبارہ پہاڑی پر گیا۔ شہر غزنی پر دوبارہ نظر دوڑائی۔ میں نے سوچا کاش! ہماری چھوٹی توپوں کے گولے اس بلندی پر پہنچے ہوں۔ ہماری توپیں اور دوں کو بیان کرتے سنا۔ ۹ پن تھیں۔ پن سے شاید پونڈ مراد تھا۔ شاید اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ ان توپوں میں ۹ پونڈ وزنی گولہ پڑتا تھا۔ دشمن کی توپیں بڑی تھیں لوگ کہتے کہ وہ ۱۸ اور ۲۴ پن کی تھیں۔ ان کو بعد میں شہر قندھار میں دیکھا۔ ان کو ہاتھی کھینچ کر لائے تھے۔ یہ توپیں بڑی تھیں اور جدید قسم کی۔ جب شام تاریک ہو گئی۔ تو اپنے عسکر کے کچھ دستوں کو میں نے واپس اردو میں آتے دیکھا۔ بعض کو دشمن سمجھ کر ان پر گولی چلا دی گئی تھی۔ لیکن نقصان نہ ہوا تھا۔ مگر اثر

کچھ اچھا نہ پڑا تھا۔ آنے والے رنجیدہ خاطر تھے۔ واپس آنے والے ایک سپاہی سے پوچھا۔ کہ آج جنگ کیسے رہی۔ بولا شاذ و نادر ہی ہمارا کوئی گولہ دشمن کے قلعہ تک پہنچا ہو۔ وہ شہر کی فصیل سے کافی دور رہے۔ اس نے مزید کہا۔ کہ دشمن کی توپوں نے ہمارا کافی نقصان کیا ہے۔ اور یہ کہ ہماری ایک توپ بیکار ہو چکی ہے۔ دشمن کے توپچی بلا کا کام کرنے والے ہیں۔ بڑے ہوشیار ہیں۔ اور نشانہ میں بے خطا۔ اور اول درجہ کے تاک۔ اس میں شک نہیں بلندی دشمن کے حق میں تھی۔ میں نے آج دیکھا کہ دشمن کے گولے فضا میں بھی پھٹتے رہے۔ رات کے آٹھ بج گئے۔ ہماری حفاظتی چوکیوں میں سے رائفل اور مشین گن چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایسا معلوم دیتا تھا رات آرام سے نہ گزرے گی۔ میں نے سوچا۔ کہ خیمہ سڑک سے دور کسی محفوظ جگہ لے جاؤں۔ اتنے میں کانوں کان حکم پہنچا۔ کہ اس رات ۹ بجے کوچ ہوگا۔ یقین نہ آیا بعد میں معلوم ہوا۔ کہ دشمن ہم کو نرغہ میں لینے کی کوشش میں تھا۔ اور ہمارا عقب کاٹنے کے درپے۔ کم از کم ہماری پوزیشن کمزور ہو رہی تھی۔

کیمپ میں باربرداری کے جانوروں کی آوازیں اور ان کے خرکاروں کی دبی دبی آوازیں آنے لگیں۔ میرا خرکار بھی ٹٹو لے آیا۔ آناً فاناً خیمے گر گئے۔ اور بارگیری لاد کر تیار کھڑی ہو گئی۔ عین ۹ بجے شب کیمپ حرکت میں آ گیا۔ ہم عقب میں رود غزنی کی جانب لوٹنے لگے۔ رات سرد تھی۔ سب سے آگے توپیں تھیں۔ توپوں کے ساتھ ساتھ ذرا پیچھے۔ میں نے چاندنی میں اعلیٰ حضرت اور اس کے ہم رکاب افسروں اور سرداروں کو دیکھا۔ ساتھ ہی رسالہ شاہی کے چند ایک سوار تھے۔ رات کا بیشتر حصہ کچھ ماہتابی تھا۔ توپیں رود غزنی میں پھنس گئی تھیں۔ اس وقت میں ان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وزیر دربار نے آواز دی۔ کہ مردمان جاغوری آگے آئیں۔ جاغوری سے مراد شاید ہزارہ تھا۔ کچھ لوگ

آگے نکلے۔ اور توپوں کو آگے دھکیلنے میں معروف ہو گئے۔ اس کوشش میں اعلےٰ حضرت خود بھی شامل تھا۔ توپوں

کو دروۂ غزنی سے پارے جانے میں کافی وقت لگ گیا ہوگا۔ اب ماہتاب غائب ہو رہا تھا۔ اور ہم غزنی

کو جانے والی اس سٹرک پر واپس پہنچ گئے۔ جس کو ہم نے ۱۵ اپریل کے دن چھوڑ کر اپنا رخ دائیں

طرف کیا تھا۔ یہاں ہم نے اس سٹرک کو پار کیا۔ اور سٹرک کے دوسری جانب غزنی کی طرف چلنے لگے۔

جدھر ہمارا ہراول جا بیٹھا تھا۔ ہم تمام شب چلتے رہے۔ سردی کافی تھی۔ بعض لوگ گھاس پھوس اور

جھاڑیاں جلا کر اپنے جسم گرم کرتے۔ اور پھر چل پڑتے۔ سپاہی گرم لباس میں نہ تھا۔ میں نے بڑا کوٹ پہن

رکھا تھا۔ پھر بھی سردی غالب تھی۔ میں نے سنا اعلےٰ حضرت نے آگ جلا کر اپنا جسم گرم کیا۔ میں

اس کو چھوٹے کوٹ میں اس رات دیکھ چکا تھا۔

اب آفتاب طلوع ہوا۔ اور ہم ایک اور درہ کو عبور کر رہے تھے۔ شاید یہ وہی درۂ غزنی تھا۔

جو بل کھا کر پھر ہمارے سامنے راستہ میں حائل ہو گیا تھا۔ اس سے آگے بلندی پر قلعہ محو گیانیوں کی

آبادی تھی۔ یہاں سے پھر اترائی تھی۔ آگے جا کر تقریباً دن کے بارہ بجے ایک تنگ چھوٹی وادی میں

اترے۔ جس کو گل باوری کہتے تھے۔

گل باوری:۔ بدھ ۱۷ اپریل کا دن تھا۔ تقریباً بارہ بجے دن کے ہم گھوڑوں سے ایک تنگ

چھوٹی وادی میں اترے۔ اور یہاں خیمے لگانے میں معروف ہو گئے۔ اس حصہ کو گل باوری کہتے

تھے۔ اس تنگ وادی میں سے ایک پہاڑی نالا گزرتا تھا۔ اس میں میٹھا پانی تھا۔ یہ وادی بلند پہاڑیوں

میں گھری ہوئی تھی۔ میں نے سنا کہ ایک میل پیچھے غزنی کی سمت میں ہمارا ہراول عسکر ڈیرہ ڈالے

پڑا تھا۔ غالباً یہ جگہ محفوظ سمجھی گئی تھی۔ اب دونوں عساکر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس وادی کا شمالی راستہ

علاقہ وراکی کو جاتا تھا۔ ہمارے بائیں جانب ہزارہ جات کا قرب تھا۔ یہ دونوں ہمارے حلیف تھے۔ اس کے علاوہ یہاں پر ہم کو آٹا دانہ بھی آسانی سے دستیاب ہونے لگا۔ نزدیک کے گاؤں والے روغن نعد اور آٹا ایندھن لیکر پہنچ جاتے۔ علاقہ ہزارہ جات سے رضاکار چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائے کیمپ میں آتے دیکھے گئے۔ ان کا مقصد عسکر میں شامل ہونے کا تھا۔ ان کے کندھوں پر ایک دو سیر آٹا کی پوٹلی کے سوا ان کے ساتھ اور کچھ نہ تھا۔ آج ایک شخص پکڑا گیا۔ اس کو سنگسار کرنے کا حکم صادر ہوا۔

۱۸ر اپریل کا دن :- آج کوئی خاص لڑائی نہ ہوئی۔ البتہ گولہ بارود تقسیم ہوا۔ دوپہر کے بعد بارش ہوئی۔ سردار عنایت اللہ خاں ناجور تھا۔ جگر کا قولنج اٹھ رہا تھا۔ اس کے علاج کیلئے جانے لگا۔ تو میں نے ہزارہ لوگوں کا ایک دستہ اردو میں داخل ہوتے دیکھا۔ شاید یہ نو وارد تھے۔ رات خدا جانے ان غریبوں نے کہاں گزاری تھی۔

۱۹ر اپریل :- کل سے ہلکی بارش کا تار بندھا تھا۔ آج سنا ہم غنیم پر زبردست حملہ کریں گے۔ چنانچہ صبح سویرے ہی لڑائی ٹھن گئی۔ دن کے گیارہ بج گئے۔ لڑائی جاری تھی۔ آج کی بارش نے ہمارے سپاہیوں کو ٹھنڈے کپڑوں میں بھگو دیا ہوگا۔ سردی کافی تھی۔ کام سے فارغ ہو کر میں ساتھ والے پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اور ایک آدھ گھنٹہ توپ و تفنگ کا مقابلہ سنتا رہا۔ یہاں سے کچھ نظر نہ آسکتا تھا۔ سنا گیا۔ کہ قلعہ بند شہر غزنی کے تقریباً چاروں طرف لڑائی ہو رہی تھی۔ محصورین شہر کو کابل سے کمک پہنچ رہی تھی۔ نرم زمین کیچڑ بنی ہوئی تھی۔ آج تازہ زخمی علاج کے لئے لائے گئے۔ نالا میں طغیانی آنے کا ڈر تھا۔ حکم ہوا کہ نالہ کے کنارہ سے خیمے اٹھالئے جائیں۔ سہ پہر کو ہزارہ لوگوں کی ایک رضاکار ٹولی گیت گاتی ہوئی اردو میں شامل ہوئی۔ کسی قدر سادہ لوگ تھے۔ اور خدمت پر آمادہ۔

۲۰؍اپریل یکم برج ثور ۱۳۰۸ء :- غزنی کے قریب پہنچے آج چھٹا روز تھا۔
لیکن غزنی سر ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ آج موٹروں والے قلعہ سے کچھ زخمی یہاں لائے گئے۔ یہ
وہی قلعہ تھا۔ (غالباً قلعہ سے مراد رباط یا کوئی بڑا گھر ہوگا۔ غزنی کے نواح میں ہر گھر بذاتِ خود
ایک قلعہ نما عمارت تھی۔) جہاں ۱۵؍اپریل کے دن خالی موٹریں رکھی گئی تھیں۔ ان زخمیوں میں
اعلےٰ حضرت کا اپنا شوفر بھی تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس روز جونہی موٹریں قلعہ میں داخل
ہوئیں۔ دشمن نے قلعہ کو اپنی گولہ باری کا نشانہ بنالیا۔ اس سے قلعہ کو شدید نقصان پہنچا۔ غنیم کا
خیال تھا۔ کہ اعلےٰ حضرت بمعہ خزانہ اور گولہ بارود اس قلعہ میں ضرور ٹھہرا ہوگا۔ اگلے دن غنیم کے
چند کوہستانی سپاہی سفید جھنڈا ہلاتے قلعہ کے باہر آئے۔ اور محافظین قلعہ کو پکارا۔ اور بولے
ہم آپکے بھائی ہیں۔ اور ایک ہی وطن کی اولاد ہیں۔ ہماری آپ سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہمارا جھگڑا تو
صرف امان اللہ خان سے ہے۔ جو بے دینی کا سرچشمہ ہے۔ اور موجودہ بربادی کا موجب۔ اس کو
ہمارے حوالہ کردو۔ لیکن اعلےٰ حضرت تو وہاں تھا ہی نہیں۔ بعض شخص قلعہ کا دروازہ کھولنے پر آمادہ
ہوگئے۔ لیکن ایک شخص ان کے درمیان سے اٹھا اور کیواڑ کے ساتھ پشت لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اور
بولا پہلے مجھے مارو۔ اور پھر کیواڑ کھولو۔ دشمن کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آؤ۔ اس سے اوروں
کے حوصلے بھی بلند ہوگئے۔ پھر کیا تھا۔ چند ایک قلعہ کی چھت پر چڑھ گئے۔ اور باہر کھڑے کوہستانی
سپاہیوں کو۔ جن کے ہاتھوں میں سفید جھنڈے تھے۔ گولیوں سے ہلاک کردیا۔ اس کے بعد قلعہ پر
شدید گولہ باری شروع ہوگئی۔ آج سارا دن ابر رہا۔ نالہ میں طغیانی آئی۔ ایک دو خیمے بہہ گئے۔
آج دشمن کے چودہ سپاہی پکڑے آئے۔ ایک مشین گن ہاتھ لگی۔ قیدی سب کے سب جوان سرخ و سپید

اور جسم کے مضبوط تھے ۔ سمت شمالی اور علاقہ لگاؤ کے رہنے والے تھے ۔ کسی کے گلے میں کوٹ نہ تھا ۔
غالباً ہمارے سپاہیوں نے اُتروا لئے ہوں گے ۔ پاؤں سے ننگے تھے ۔ صرف لٹھے کا کرتہ اور پاجامہ اب
ان کے جسموں پر تھا ۔ اور سردی اور خوف سے کانپ رہے تھے ۔ میرے خیمہ کے پاس ہی لب نالہ ان
سب کو ایک جگہ پاس پاس زمین پر بٹھا دیا گیا ۔ اور پھر ان سب پر ایک ترپال ڈال دیا ۔ ان سب کو
ایک رسی میں باندھ رکھا تھا ۔ اور وہ بے زبان ترپال کے نیچے دب بیٹھے ۔ ہمارا ایک سپاہی بولا ۔ اس
اونچے لمبے جوان نے اپنی مشین گن سے ہمارے بیسوں جوان فنا کئے ہیں ۔ یہ بانکا جوان کوہستانی تھا
سبز آنکھوں والا ۔ اور قد کاٹھ کا مضبوط ۔ اسکی آنکھوں میں اب خوف نہ تھا ۔ بلکہ نفرت اور جذبہ انتقام بھرا ہوا تھا ۔

۱۲/اپریل کا دن :۔ آج بہت سے زخمی لائے گئے ۔ تقریباً سارا دن مرہم پٹی
میں گزر گیا ۔ بسنا وردک لوگ کچھ آئے تھے ۔ وردک ہمارے حلیف تھے ۔ ہمارے ہراول کا کماندار عبداللہ
غالباً اسی قبیلہ سے تھا ۔ وردک لوگوں کی کوشش تھی ۔ کہ کابل سے آنے والی کمک غزنی تک نہ پہنچ
دی جائے ۔ علاقہ وردک کابل اور غزنی کے درمیان پڑتا ہے ۔ ان کی کوشش رائیگاں گئی ۔ کمک
نہ رک سکی ۔ اگرچہ وردک قبیلہ کی درخواست پر ایک قاطری توپ ان کی مدد کے لئے بھیجی بھی گئی تھی ۔ پھر
غزنی محصور تھا ۔ ایک بجے دوپہر تک مطلع صاف رہا ۔ پھر ابر آلودہ ہو گیا ۔ دوپہر کے بعد لڑائی پھر زور
گئی ۔ دشمن کی توپیں بڑے پیمانہ پر کام کرتی سنائی دیتی تھیں ۔ شیراپ نل گولے پھٹ رہے تھے
دور بلند فضا میں ابر کی مانند دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اپنے پھٹنے کی جگہ اپنا نشان پیچھے چھوڑ جاتے
ادیب آفندی نے مجھے بلایا ۔ اور عبداللہ کی شناخت کرائی ۔ اس عبداللہ نو مسلم کو میں
پہلی بار ۱۹۲۴ء میں ہرات کے شہر میں دیکھا تھا ۔ اُس وقت عمر میں کوئی بیس بائیس سال ہو

وہ ہرات کے نائب الحکومت مرزا زمان الدین خاں کی نجی مجالس میں اکثر آتا جاتا۔ اور مرزا زمان الدین خاں اس کے ساتھ عزت اور ہمدردی سے پیش آتا۔ عبداللہ کو روسی بنایا جاتا تھا۔ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنا ملک کیونکر چھوڑ آیا تھا۔ اور اس کے ہرات میں رہنے کا کون سبب بنا۔ لیکن بظاہر وہ اب مسلمان تھا۔ یورپین رنگ ڈھنگ کا تھا۔ کبھی مغربی لباس میں نظر آتا۔ اور کبھی وطنی لباس میں بعد میں میں نے دیکھا۔ کہ وہ عام موٹے گاڑھے کی شلوار اور کرتہ پہننے لگ گیا تھا۔ اور موٹے گاڑھے کی پگڑی اس کے سر پر ہوتی۔ اور لکڑی کا کام کر کے اپنا پیٹ پالتا۔ سال دو سال میرے سامنے ہرات میں رہا۔ نائب الحکومہ محمد ابراہیم خان کے زمانہ میں جب محمد محفوظ خاں پشاوری ہرات میں کوتوال بن کر آیا۔ تو اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد میں نے عبداللہ کو کوتوالی کے صحن میں زیر حراست دیکھا۔ حکومت کا شاکی تھا۔ کہنے لگا۔ بلا وجہ اسے محبوس کر رکھا ہے۔ اسے اپنا گناہ معلوم نہ تھا غالباً اسے غیر ملکی جاسوس سمجھ لیا گیا تھا۔ اس ملاقات کے بعد میں نے پھر عبداللہ نومسلم کو ہرات میں نہ دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے۔ اسے کابل بھیج دیا گیا ہو۔

آج ۱۸؍اپریل کے دن ایک بار پھر میں نے عبداللہ کو آخری بار دیکھا اور وہ حراست میں تھا۔ اور غالباً ایک غیر ملکی جاسوس تصور کیا جا چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ امیر حبیب اللہ نے کابل میں تخت پر بیٹھتے ہی سب قیدیوں کو آزاد کر دیا تھا۔ اور اس زمرہ میں اس نے بھی آزادی پائی۔ اور اس خیال سے کہ مبادا پھر گرفت میں آ جائے وہ کابل کو چھوڑ کر غزنی کی طرف نکل آیا تھا اور چونکہ وہ راستوں سے نابلد تھا۔ لہٰذا ادھر نکل آیا۔ اور شبہ میں پکڑ لیا گیا۔ یہ کہ عبداللہ کہاں تک صداقت سے کام لے رہا تھا۔ اسے اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔ عبداللہ کے روبرو میں نے

ادیب آفندی کو حقیقت بیان کردی۔ بہر حال میں اس کے حق میں بلا وجہ میں زیادہ کچھ نہ کرسکتا تھا۔
اور نہ ہی ادیب آفندی سے اس سے متعلق کوئی بات پوچھ کر ذاتی دلچسپی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ افغان لوگ
بڑے شکی مزاج تھے۔ اور میں بھی خود ایک اجنبی تھا۔ اور موجودہ ماحول میں اپنے آپ کو ہر قسم کے شک و
شبہ سے بالاتر رکھنے پر مجبور تھا۔ وہ مغربی شکل و صورت کا تھا۔ اور وطنی لباس میں۔ شاید انگریزی
جاسوس سمجھ لیا گیا ہو۔ یا پھر امیر حبیب اللہ کا کارندہ ہو۔ ایسے حضرت قدرتی طور پر اس وقت اچھی ٹوڈ
میں تھا۔ اور اس کے لئے انگریز یا امیر حبیب اللہ ایک ہی چیز تھے۔ دوسرے دن ۲۲ر اپریل کو عبداللہ
سنگسار کر دیا گیا۔ مجھے بہت صدمہ ہوا۔ میرے ملازم عبدل نے سنگساری دیکھی۔ اس نے مجھے
بتایا۔ عبداللہ برابر کہتا رہا۔ کہ وہ بے گناہ تھا۔ عبداللہ نے کیوں مجھے اپنی صفائی میں پیش کیا۔ اس کا
کچھ جواب میری مندرجہ بالا تحریر میں موجود ہے۔ ہرات میں میں خود عبداللہ کو نو مسلم اور اجنبی جان
کر عزت و احترام سے پیش آتا۔ مرزا زمان الدین خان میرا بھی محسن تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۲۳ء میں
مرزا زمان الدین خان والئ کابل تھا۔ اور میں اس وقت کابل میں ڈاکٹر صاحب تھا۔ میرے علاج سے
وہ مستفید ہوا تھا۔ چنانچہ جب وہ کابل سے تبدیل ہو کر ہرات آنے لگا۔ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے آیا۔
اور اس کے ہاں عبداللہ سے اکثر ملاقات رہتی۔ عبداللہ نے اب مجھے کیمپ میں چلتے پھرتے دیکھا ہو گا۔
میرا خیمہ بھی تو ادیب آفندی کے خیمہ کے قریب ہی تھا۔

۲۳ر اپریل ۱۹۲۹ء :- خوراک کی قلت ہو گئی۔ قندھار سے مزید کمک نہ پہنچی۔ اور
نہ ہی کسی قسم کا سامان و رسد پہنچا۔ آمد و رفت کا سلسلہ مابین قلات اور غزنی بالکل منقطع تھا۔ سلسلہ
ڈاک رک چکا تھا۔ غالباً نقدی اور گولہ بارود کی کمی بھی درپیش ہو گی۔ آج کھانا بھی بے نمک کھایا۔

تک نہ ملا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ اور آفتاب درخشاں۔ دس بجے دن کے دو ہوائی جہاز کابل کی طرف سے آئے۔ جہاز بہت بلندی پر تھے۔ ان سے کیمپ پر بمب گرے۔ دو گھوڑے مر گئے۔ بعد دوپہر ایک دھماکہ ہوا۔ کچھ نوجوان بے سمجھ ایک ان پھٹا بم اپنے خیمہ میں اٹھا کر لے گئے۔ اور اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ بم پھٹا اور دو جوان اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک بم ہوائی جہاز سے میرے ساتھ کی پہاڑی پہلو پر گرا۔ کوئی چند گز کے فاصلہ پر۔ کوئی نقصان نہ ہوا۔ نشانہ پر زرد پوڈر بکھر گیا تھا میں نے آج پناہ کے لئے احتیاطاً ایک گڑھا اپنے خیمہ کے پاس کھدوایا۔ جس میں مجھے ایک دفعہ صرف بیٹھنا پڑا۔ تنگ وادی میں ایک ہی لائن پر کوئی آدھا آدھ فرلانگ کے فاصلہ پر چار بمب گرے تھے

۲۴ر اپریل:۔ سردار عنایت اللہ کو دیکھنے گیا۔ خیمہ میں اعلےٰ حضرت بھی بڑے بھائی کی بیمار پرسی کے لئے آگیا۔ اعلےٰ حضرت کمزور ہو گیا تھا۔ رنگ سیاہ پڑ رہا تھا۔ چپ اور متفکر تھا۔ سنا کہ دشمن کا پلہ بھاری تھا۔ اور ہم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ آٹا آج ڈپو سے مفقود تھا۔ آج دوپہر آغا اشرف کی لاش لائی گئی۔ اور وادی کے ایک جانب بلندی پر دفنا دی گئی۔ کسی قسم کی فوجی رسم ادا نہ کی گئی۔ نہ تو جنازہ کی دعوت ہوئی۔ اور نہ ہی لوگوں کا اجتماع عمل میں آیا۔ احتراماً کوئی الوداعی رائفل فائر نہ سنا۔ ہمارے ساتھ کوئی بینڈ باجا نہ تھا۔ ڈھنڈورچی بھی ٹین کا ڈبہ بجا کر اعلان کرتا۔ ڈھول تک نہ تھا۔

۲۵ر اپریل (۶ برج ثور) آج شاہی خیموں کے رقبہ میں پہرہ سختی سے دیا جانے لگا۔ ان خیموں کے مابین عبدالرؤف خان قندھاری سردار کو کھڑا دیکھا۔ اس نے ایک راہرو کو ادھر سے گزرنے پر ٹوکا۔ معلوم ہوا دشمن قریب آگیا تھا۔ اور اس نے قلعہ آہن گران واپس چھین لیا تھا۔ ہمارے جوانوں نے شہر غزنی کی فصیل تک پہنچنے کے لئے یکے بعد دیگرے رہائشی مکان (قلعے) فتح کئے تھے۔ اور ان کے لئے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ اب یہ قلعے گھر آہستہ آہستہ

واپس دشمن کے ہاتھ میں جا رہے تھے۔ میں دو بجے دن نظامی طبیب کے خیمہ میں گیا۔ وہاں سنا۔ کہ وزیر دربار نے تجویز کیا تھا۔ کہ سب زخمیوں کو کجاوہ میں لٹا کر قلعہ موٹراں میں شام سے پہلے پہنچا دیا جائے۔ اور نظامی شفاخانہ کا عملہ بھی ساتھ چلا جائے۔ اس پر عمل نہ کیا جا سکا۔

غزنی کا محاصرہ اٹھالیا گیا: ۔شام کے قریب حکم پہنچا۔ کہ رات دس بجے کوچ ہوگا۔ سب لوگ واپس متقر جائیں گے۔ چنانچہ وقت معین پر کیمپ حرکت میں آیا۔ بدقسمتی سے میری سواری کا گھوڑا کھل گیا۔ اور لوٹنے والوں کی زد میں رات کے اندھیرے میں بے سوار ہی شامل ہو گیا۔ تلاش بے سود تھی۔ آج شب خاصی نفسا نفسی تھی۔ ہر شخص کوشش میں تھا۔ کہ وہ پیچھے نہ رہ جائے۔ اتفاق سے نظام کے کمپوڈر نے مجھے بے اسپ کھڑا دیکھا۔ اس نے خوشی سے خود اپنا ٹٹو مجھے پیش کیا میں نے غنیمت جانا۔ اور سوار ہو گیا۔ کمپوڈر خود ایک ساتھی کے پیچھے دوسرے ٹٹو پر سوار ہو گیا۔ ورنہ مجھے اس رات پیادہ سفر کرنا ہوتا۔ اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہم چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ کوئی میل دور جا کر میں اکیلا ہو گیا۔ میرے ملازم اور سامان کا مجھے علم نہ رہا۔ میرا ٹٹو بارگیری میں ملا جلا مجھے خود ٹھیک راستہ پر لے جا رہا تھا۔ راستہ کبھی خشک ہوتا اور کبھی گیلا کیچڑ۔ کئی سوار گیلے کھیتوں میں رُک گئے تھے۔ لیکن کچھ ایسی افراتفری نہ تھی۔ میں نے وزیر دربار کو دیکھا۔ وہ ایک دہقان سے راستہ کی تحقیق کر رہا تھا۔ یہ دہقان اکیلا اس وقت کھیت کو پانی لگا رہا تھا۔ اُسے علم نہ تھا۔ کہ وہ وزیر دربار سے مخاطب تھا۔ دہقان بولا۔ واپس کیوں جا رہے ہو۔ وزیر دربار نے جواب دیا۔ ہم اپنے نظام کو درست کر کے دوبارہ آئیں گے اور فرقہ مشر غوث محمد خان کو ساتھ لائیں گے۔ ہمیں کامیابی کی پختہ امید ہے۔ یہ کہہ کر وزیر دربار آگے نکل گیا۔

بظاہر ہماری واپسی کے کئی وجوہ تھے۔ عقب میں قند ھار سے انقطاع رسد اور کمک کی قلت۔ جنگ کا خلاف توقع طول کھینچنا جس کے لئے ہم تیار نہ تھے۔ اور دشمن کے مقابلہ میں ہماری

بڑھتی ہوئی کمزوری۔ حقیقی وجوہ سے تو شاہ ہی بخوبی آگاہ ہوگا۔ غوث محمد خان ۱۹۲۷ء میں ہرات میں
زقہ مثر تھا۔ اور اچھا قابل افسر سمجھا جاتا۔ وہ سپاہی کے درجہ سے ترقی کرتا اس عہدہ جرنیلی پر پہنچا تھا
اور سپاہی کی تکالیف اور اس کے کام سے بخوبی آگاہ تھا۔ اپنے عملہ میں ہر دلعزیز بھی تھا۔ اور جری
اور منتظم بھی۔ شکل و صورت اور جسمانی قطع وضع سے رعب ٹپکتا تھا۔ وزیر دربار کی بات کہ وہ قندھار
پہنچ چکا تھا، غلط تھی۔

مقابتاً امیر حبیب اللہ کے سب کے سب سپاہی تنومند اور جوان تھے۔ صدیوں سے علاقہ
کوہستان کے لوگ پیشہ سپہ گری اپنائے ہوئے تھے۔ جس شاہی فرد کا طرفدار یہ علاقہ ہوتا۔ وہ اس پر
اتراتا۔ میں نے سنا کہ اس علاقہ سے شاہی گارڈ کے سوار خصوصی طور پر چنے جاتے تھے۔ کابل کی
پولیس میں بھی ان کی خاصی تعداد ہوتی۔ ہمارے پنجابی علاقہ چکوال اور پوٹھوہار کے لوگ شکل و شباہت
اور خو بو میں ان لوگوں سے ملتے جلتے تھے۔ اب امیر ان کے اپنے علاقہ کا تھا۔ اور حکومت ان کی
اپنی۔ کیوں نہ سر دھڑ کی بازی لگا دیتے۔ امیر عبدالرحمٰن خان اس علاقہ کے قرب اور اس کی اہمیت
سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے امیر شہید کی پہلی دلہن اسی علاقہ سے چنی تھی۔ اس نے تخت
کابل کو مضبوط بنانے کے لئے اپنے بیٹے امیر شہید کے لئے بیویاں ملک افغانستان کے سرکردہ
اور طاقتور گھرانوں سے منتخب کی تھیں۔ اس میں علاقہ کوہستان کو زبردست اہمیت حاصل
تھی۔ پھر اس علاقہ کا تو کابل سے دامن چولی کا رشتہ تھا۔ ایک جنگجو علاقہ اور کابل سے اتنا
قریب۔ علاقہ ہزارہ جات سے جو رضا کار آتے۔ ان کو اسلحہ نہ ملا۔ لہٰذا وہ خوش نہ تھے۔ غالباً اسلحہ
وافر تھا ہی نہیں۔ اور یہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ میدان جنگ میں قندھاریوں سے لیکر ان کو دیا جاتا۔
غرضیکہ عسکر اور بار برداری ملے جلے رات کے اندھیرے میں چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں
رات کے وقت کوئی مزاحمت یا گڑبڑ نہ ہوئی۔ تاہم پر کسی طرف سے گولی نہ چلی۔ تکان ضرور تھی۔ اور

بے خوابی - دن چڑھا۔ جوں جوں آفتاب بلند ہوا شب کی بے خوابی اور سفر کی تکان دور ہوتی گئی۔ اس آفتاب دادہ تازگی سے وہی لوگ آشنا ہیں۔ جنہوں نے تمام رات منزل ماری ہو۔ اور رات آنکھوں میں نکالی ہو۔ جب دن کا اجالا ذرا زیادہ ہوا۔ تو ہم نے اپنے آپ کو رباط نانی کے پاس پایا۔ ہم نے کوئی بیس بائیس میل کی منزل ماری ہو گی۔ لیکن خود غزنی سے دس بارہ میل دور ہوں گے۔ یعنی دشمن کی زد سے بالکل باہر نہ نکلے تھے۔ یہاں پہ کوئی مشکل آدھ گھنٹہ سواری کی حالت میں ہی توقف کیا۔ غالباً اپنے عساکر کو اکٹھا ہونے کا موقع دینا مقصود تھا۔ نزدیک کے گاؤں سے عین اس وقت ڈھول پٹنے کی آواز اٹھی۔ وقت کی نزاکت اور شکست کی حالت میں یہ آواز دل شکن ضرور تھی اور ہیبت سے بھری ہوئی تھی۔ رات کی بے خوابی اور کمر شکن تکان اور صبح کا یہ خاموش سماں اس ہیبت میں کئی چند زیادہ خوفناک اضافہ کر رہے تھے۔ ڈھول کی دھڑکن دل کی دھڑکن کو تیز کر رہی تھی۔ ہم پہ نہ کوئی حملہ ہوا اور نہ ہی گولی چلی۔ خود گاؤں والوں پر ہماری یکایک نمو داری سے خوف وہراس طاری ہو گیا تھا۔ اور ڈھول کی اس پٹائی میں خود گاؤں والوں کو انتباہ تھا۔ کہ ان کو ایک غیر متوقع خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اور ان کو اپنی پناہ کا انتظام کرنا تھا۔

اب ہم سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ اعلےٰ حضرت اور اس کے ساتھی نمایاں کھڑے تھے۔ ہم دوبارہ چل پڑے۔ یہاں سے ہم نے شاید عام سڑک چھوڑ دی تھی۔ اور ایک غیر آباد ریتلا راستہ اختیار کیا تھا۔ سواری کے جانور تھک رہے تھے۔ مگر سفر ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ معلوم نہ تھا۔ کہ پڑاؤ کہاں اور کب ہو گا۔ بھوک اور پیاس کے مارے لاغر جانور راستہ میں ہمت ہار رہے تھے۔ میری اپنی ٹانگیں بھاری اور بے حس ہو رہی تھیں۔ کمر ٹوٹ رہی تھی۔ سواری سے اتر پڑا۔ اس خیال سے کہ پاؤں میں خون پھر دوڑنے لگے گا۔ اپنے ٹٹو پر ایک تھکے ماندے

ماء سکار کو بٹھا دیا۔ ریت گرم ہو رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب ایک قریب کے رہائشی قلعہ سے
ام پر رائفل کے فائر ہوئے۔ ہم ذرا رک گئے۔ قلعہ پر ہماری توپ نے دو فائر کئے۔ گولی
نا بند ہو گئی۔ اور ہم نے آگے بڑھنا پھر شروع کر دیا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ اور ہم اب رباط
تک پہنچ چکے تھے۔ یعنی غزنی سے کوئی تیئیس میل کے فاصلہ پر۔ یہاں پر اُتراک شروع ہو گیا
تکاوٹ بے حد تھی۔ پیٹ خالی تھا۔ پیاس سے حلق کانٹا بن رہا تھا۔ زمین کی ریت تپی ہوئی
ں۔ میرا ملازم آج نظر نہ آیا۔ ٹٹو سے اتر کر میں زمین پر لیٹ گیا۔ سایہ کا درخت دیکھنے
ز تھا۔ عسکر کا بیشتر حصہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن میرا ملازم نہ آیا۔ مجھے آئے دو گھنٹے گزر گئے۔
ر اعلےٰ حضرت بھی ابھی نہ پہنچا تھا۔ آج کے بعد اعلےٰ حضرت کا معمول بن گیا تھا۔ کہ وہ سب
فر میں منزل پر پہنچتا۔ شاید اس خیال سے کہ عسکر بے ترتیبی اور نقصان سے دوچار نہ ہو۔
ور اس کو شکست کا احساس بھی نہ ہو۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اور میرا ملازم بخیریت پہنچ گیا۔
لازم نے بتایا۔ کہ یہاں سے ذرا غزنی کی جانب دشمن کے کچھ لوگوں نے ان پر گولی چلائی تھی۔
ں سے صرف ایک دو آدمی زخمی ہوئے تھے۔ آج رات خطرے سے خالی نہ تھی۔ اس علاقہ کے
گ ہمارے سخت دشمن تھے۔ گاؤں خالی تھا۔ اگر ان کا بس چلا۔ تو نقصان پہنچانے میں کوتاہی
کریں گے۔ وہ اب ہماری شکست سے آگاہ تھے۔ ہماری نقل و حرکت ان سے پوشیدہ نہ
ی۔ خوش قسمتی سے رات خیریت سے گزر گئی۔ تھکاوٹ اس درجہ تک تھی۔ کہ بغیر کچھ کھائے پیئے
ں پڑتے ہی سو گیا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے۔ کہ کوئی آیا اور اس نے کہا۔ میں ایک غیر محفوظ
گہ میں پڑا ہوں۔ اپنی جگہ بدل لوں۔ لیکن تھکاوٹ اور نیند مجھے ہر قسم کے خطرہ سے لاپروا
ور بے نیاز بنا چکی تھی۔

رباط مشکی سے کوچ

میرے ملازم عبدل نے جب مجھے جگایا۔ تو بار گیری لد چکی تھی۔ آنکھ کھولی تو سورج کنارہ افق پر نمودار ہو چکا تھا۔ اور کچھ لوگ اب بھی باندھا باندھی میں معروف تھے۔ اکثر تیار کوچ کے حکم کے لئے منتظر کھڑے تھے۔ میرے خیمہ کے قریب ایک کوٹھا پر سید وخاں کھڑا تھا۔ اور زبان پشتو میں اپنے نوجوانوں کو بلند آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا۔ کہ ہمارا ہراول اب اردو میں شامل ہو چکا تھا۔ اور میں نے ہراول میں رات گزاری تھی۔ دونوں عسکر یک جا ہو گئے تھے۔ کوئی سات بجے بارگیری ہلی۔ اور اس کے پیچھے رضا کار عسکر نے حرکت کی۔ عین اس وقت دو طیارے غزنی کی جانب سے آئے۔ لیکن عسکر بغیر رکے اور اپنے راستہ سے ادھر ادھر ہٹے اپنے سفر میں مشغول رہا۔ یہ ہوائی جہاز بغیر بم گرائے چلے گئے۔ جب اعلیٰحضرت سوار ہونے لگا۔ تو علاقہ کے لوگوں نے ان پر فائر کیے۔ توپ اور مشین گن کے فائر کے سامنے دشمن ٹھہر نہ سکا۔ کوئی نقصان نہ ہوا۔ اب ہمارے ساتھ صرف ایک توپ تھی۔ ہمارے جوان اب خالی گاؤں میں چلے جاتے۔ اور جو کچھ ہاتھ لگتا لے آتے۔ آج ایک عجیب واقعہ سننے میں آیا۔ جس کا باور کرنا مشکل تھا۔ دشمن کے کچھ لوگ ہمارے ایک آدمی کو گھسیٹے لئے جا رہے تھے۔ وہ مدد کے لئے پکارتا رہا۔ لیکن اسے چھڑانے کی کوشش نہ کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ دور ایک ریت کے ٹیلہ کے عقب میں نظر سے غائب ہو گیا۔ غالباً ہمارے سپاہی دشمن کے درپے ہوں گے۔

جن لوگوں کو ہم غزنی کے قریب موڑوں والے قلعہ میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ مصیبتیں اٹھاتے بھوکے پیاسے علاقہ ہزارہ کے دشوار گزار پہاڑی راستوں پر سے گزر کر آٹھویں روز ہمارے ساتھ مقام منظر میں آملے تھے۔ ان میں ہندوستانی ڈرائیور بھی تھے۔ ان کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ سردی

اور بھوک نے اُن کے جسم نحیف اور لاغر کر دیئے تھے۔ سخت گڑھ سے تھے۔ ان میں سے بعض کی اپنی موٹر لاریاں تھی۔ جو اب دشمن کے قبضہ میں جا چکی تھیں۔ حکومت نے اب ان کے روزانہ خرچ کے لئے ایک روپیہ فی یوم مقرر کر رکھا تھا۔ اِس سے اُن کا پیٹ بمشکل بھرتا تھا۔ ایک موٹر ڈرائیور کرم داد جہلمی نے اپنے سفر کی تکالیف بیان کرتے ہوئے ایک قصہ سنایا۔ جو خوانین اور علماء قندھار سے اعلےٰ حضرت کے ہمرکاب آئے تھے۔ ان میں ایک مُلا محمد حسین صاحب بھی تھے۔ (یاد رہے کہ افغانستان میں مُلا سے مراد ایک زبردست برگزیدہ عالم کی ہستی ہے۔) وہ جید عالم اور خدا رسیدہ بزرگ مانے جاتے تھے ہزاروں نفوس ان کی مریدی کا دم بھرتے۔ خود اعلیٰ حضرت بھی ان کی بڑی توقیر کرتا۔ اور اِن سے دعا کا طالب رہتا۔ سننے میں آیا تھا۔ کہ ایک دفعہ اعلےٰ حضرت اِن سے دُعا کا طالب ہوا۔ مولوی محمد حسین فرمانے لگے۔ صرف فتح چاہتے ہو۔ یا زندہ امیر حبیب اللہ کا اپنے قبضہ میں لانا بھی۔ پھر جلدی میں خود ہی مسکرا کر کہہ دیا۔ کہ آخرالذکر نحل مناسب نہ ہوگا۔ دروغ برگردن راوی۔ انہی صاحب کا ذکر بھی آگیا۔ کرم داد موٹر ڈرائیور پوٹھو واری قصہ بیان کرتا اور ساتھ ہی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوتا جاتا۔ پھر سنجیدہ بن کر اور کانوں پر ہاتھ دھر کر کہنے لگا۔ استغفار! وہ وقت خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اس رات یہ ہنسی غائب تھی نام کو بھی نہ تھی۔ ہم اندھیری رات میں موٹروں والے قلعہ سے اپنی جانیں بچانے کے لئے نکل پڑے تھے۔ اُن پر ہر لمحہ دشمن کا خوف طاری وساری تھا۔ اُن کے دل مارے ہراس کے دھڑک رہے تھے۔ فکر دامنگیر تھا۔ کہ اب بھی دشمن کی گولی کا شکار ہوئے یا پکڑے گئے۔ لہٰذا تاریکی بھی کیسی نعمت ہے۔ اس نفسا نفسی اور بدحواسی میں وہ گیلے کھیتوں کے کیچڑ میں پھنس رہے تھے۔ اور ناہموار زمین پر ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہے تھے۔ اس بدحواسی میں غالباً مُلا محمد حسین بھی شامل تھا۔ اس کے ہمراہ ہمیشہ دو تین ملازم خدمت کے لئے حاضر رہتے۔ یہی اس کو گھوڑے پر سوار کرتے

اور سوار رکھتے۔ لیکن اس شب فراری میں اس کے ہمراہ صرف ایک ہی ملازم باقی تھا۔ اس اکیلے ملازم نے اس افراتفری میں چند بار ملا صاحب کو سنبھالنے کی سعی کی لیکن رات تھی سرد اور اندھیری۔ ملا صاحب اپنی بڑی گرم پوستین میں لپٹا زمین پر گر پڑا۔ ملازم اسے وہیں چھوڑ چلتے بنا۔ کوئی بولا افسوس! وہ دیکھو مولوی محمد حسین گر گیا۔ ملازم بولا مولوی صاحب نہیں گرے صرف اُن کی پوستین گری ہے۔

ہاں تو ہم ۲۷ر اپریل کے دن صبح رباط مشکی سے چل پڑے۔ سڑک پر بارگیری جا رہی تھی۔ اور سڑک کے دونوں جانب کچھ فاصلہ پر ہمارے محافظ سوار ساتھ ہو رہے تھے۔ باوجود احتیاطی احکام کے بارگیری کے محافظ اپنے ہی سواروں پر دشمن سمجھ کر گولی چلا دیتے تھے۔ دوپہر کے وقت قرہ باغ پہنچے۔ لیکن آج نہ تو وہاں شامیانہ کھڑا تھا۔ اور نہ ہی گرم گرم چائے۔ انتظار میں دیکھی۔ اس جگہ ایک نفس بھی دکھائی نہ دیا۔ ایک جگہ راستہ میں ہم پر گولی چلی۔ جس کا جواب ہمارے جوانوں نے بڑی مستعدی سے دیا۔ ایک جگہ راستہ پر ہم کو پورا ایک گھنٹہ رُکنا پڑا۔ افواہ تھی۔ کہ اگلے پڑاؤ پر دشمن لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہم نے سڑک چھوڑ دی۔ اور قرہ باغ سے دور کوئی چار میل کے فاصلہ پر ایک جگہ جو قلعہ شیر احمد خان کے نام سے موسوم تھی۔ جا کر اُترے۔

قلعہ شیر احمد خان

شیر احمد خان وہی صاحب تھے۔ جنہوں نے ہماری پیش قدمی کے وقت ۱۳ر اپریل کے دن اعلےٰ حضرت کو چائے ناشتہ دیا تھا۔ ابھی اترے ہی تھے۔ کہ دو طیارے سمت غزنی سے پرواز کرتے ہوئے جانب قندھار غائب ہو گئے۔

بعد میں معلوم ہوا۔ کہ ان کے طیارہ وہاں ان کو بھگا کر کابل سے قندھار لے آئے تھے۔ تاکہ
اعلٰحضرت کے کام آسکیں۔ اس خبر کی تائید بعد میں قندھاری اخبار "طلوع افغان"
سے ہوئی۔ آج ایک افواہ اُڑی۔ اور یہ بڑی زوروں پر تھی۔ کہ سردار نادر خان
نے کابل فتح کرلیا ہے۔ اور اس نے اعلٰحضرت کے بڑے بیٹے شہزادہ ہدایت اللہ جان
کو تخت پر بٹھا دیا ہے۔ یہ بات غلط تھی۔ شاید اس سے مطلق پروپاگنڈہ مقصود
ہو۔ یہ شکست خوردہ سپاہیوں کے حوصلے بلند رکھنے میں موزوں تھی۔ اور دشمن
کے طرف داروں کے لئے حوصلہ شکن۔ اس خبر پر کافی تنقید ہوئی۔ بے کاری میں اچھا
خاصہ مشغلہ بن گیا۔ ۱۸ر اپریل کا دن یہیں پر گزرا۔ کوئی غیر معمولی بات ظہور میں
نہ آئی۔

ہم مقر کی طرف اور پیچھے ہٹ آئے

۱۹ر اپریل بروز پیر صبح پونے آٹھ بجے ہم پھر چل پڑے۔ اور ۹ بجے کے
قریب رباط گوائیں پہنچ چکے تھے۔ اس رباط کا علاقہ ہمیشہ سب سے زیادہ
مخدوش شمار ہوتا تھا۔ رباط کے قریب سڑک پر اور کچھ سڑک سے ایک طرف
توڑی پھوڑی موٹر لاریاں نظر پڑیں۔ یہ ہماری وہ گاڑیاں تھیں جن کو دشمن
نے یہاں روک لیا تھا۔ اور ان کا سامان لوٹ کر توڑ پھوڑ دیا تھا۔ ان کے
مسافروں کا حشر لوٹنے والوں کو ہی معلوم ہوگا۔ رباط کے آگے پیچھے

ڈاکخانہ جات کی تباھی کے مناظر: سڑک کے ساتھ ساتھ تار کے کھمبے ٹوٹے ہوئے دیکھے۔ اور تاریں کٹی ہوئی۔ یہ وہی رباط تھی جہاں اعلےٰحضرت نے پیش قدمی کے وقت ایک سفید ریش پر کرم نوازی کی تھی۔ ادباً اس کی سفید ریش کو چھو کر منت کی تھی۔ کیونکہ ایک سپاہی اس کے مکان سے جلانے کا کچھ ایندھن اٹھالایا تھا۔ جب ہم رباط سے ذرا میل دو میل دُور آگے نکل آئے۔ تو سڑک کے دونوں جانب سے ہم پر گولی برسائی گئی۔ میں گھوڑے سے اتر کر ایک خشک نالا میں بیٹھ گیا تھا۔ دشمن گھاٹیوں کے پیچھے بیٹھا تھا۔ لیکن بہت جلدی ہی راستہ صاف ہوگیا۔ جونہی ہمارے سواروں نے ادھر کا رخ کیا۔ اب ہمارے سواروں نے اُن کے گاؤں میں آگ لگا دی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف دور دور دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کے بعد رباط اوبہ تک دشمن دکھائی نہ دیا۔ رباط اوبہ کے پاس دونو طرف تار کے کھمبے ٹیڑھے تھے۔ ایک دو کے سرے مڑ کر سڑک سے لگ رہے تھے۔ ان کو ٹیڑھا اور سربسجود کرنے میں غنیم نے طاقت کا کافی مظاہرہ کیا تھا۔ رباط کو اتین کے رہنے والے کھمبوں کو توڑنے میں ہوشیار تھے۔ بجائے ٹیڑھا کرنے کے انہوں نے کھمبوں کے نچلے سیاہ دیگی حصے توڑ ڈالے تھے۔ اور ان کا توڑنا بہت آسان تھا۔

اب ہم رباط اوبہ سے ذرا آگے نکل گئے۔ اور ایک خالی گاؤں میں پڑاؤ کیا۔ جُو کے کنارہ پر میں نے اپنا خیمہ لگوایا۔ میرا ملازم آج ایک نئی ملتانی ساخت کی پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ آج وہ بھی پیادہ سپاہیوں کے ہمراہ ایک گاؤں میں چلا گیا تھا۔ اور ایک گھر کے فرش کے نیچے سے اس کو ایک منڈیل ایک نیا جوتا۔ اور ایک نئی خرجی ملی تھی۔ یہ اشیائ فرش اکھاڑنے پر دستیاب ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ اب لوٹ مار میں شامل ہوتا تھا۔ اس سے اسے منع کیا۔ بہر حال خرجی ہمارے کام آئی۔ میں چائے پی رہا تھا۔ ایک ہندی مہاجر رضا کار میرے

پاس آیا۔ اور اس نے میرے ملازم کچھ کھانڈ اور کچھ گرم مصالحہ دیا۔ جو اس نے آج راستہ میں لوٹا
تھا۔ شفاخانہ کا ایک خدمتگار اردلی مختلف رنگوں کے دھاگے لوٹ لایا تھا۔ اور اس کے علاوہ
اس کی نظر انتخاب پرانے چمڑے کے ٹکڑوں پرانی چرمی پیٹیوں اور کہنہ لگاموں اور ایسی ہی
دیگر اشیائے پر پڑی تھی۔ وہ ٹھیک اپنے مطلب کا مال لایا تھا۔ جس کی قدر و قیمت دوسری نگاہوں
میں نہ تھی۔ یہ اردلی قندھار سے چلتے وقت صرف دو ماہ کی پیشگی تنخواہ ساتھ لایا تھا۔ جو وہ
خرچ کر چکا تھا۔ اس کے پاس اب ایک پیسہ بھی تنخواہ سے باقی نہ بچا تھا۔ اس نے بہت
کوشش کی کہ دوسرے سپاہیوں کی طرح اس کو بھی مفت خشک راشن اور ایندھن ملے۔
لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ قانون کچھ ایسا ہی ہوگا۔ یہ اردلی خوش قسمتی سے اچھا خاصا
پینہ دوز تھا۔ اس نے فرصت کا وقت پرانے جوتوں کی مرمت میں صرف کرنا شروع کر دیا
تھا۔ وہ اپنے خیمہ سے باہر بیٹھ جاتا۔ کام کی کوئی کمی نہ تھی۔ اب وہ روزانہ خاصی اچھی کمائی
کر لیتا۔ آج کا بظاہر چند کوڑی کا مال اس کے لئے بہت اہم تھا۔ اس کمائی سے نہ صرف اس
نے اپنا پیٹ پالا۔ بلکہ دوسرے ملازمین کو بھی کھلا پلا کر اپنا گرویدہ بنا لیا۔ شفاخانہ کا دوسرا
ملازم دو مرغیاں لایا۔ اس کا ایک دوست گھی کی کپی جس میں کوئی بارہ چھٹانک گھی ہوگا۔
لوٹ لایا تھا۔ کس قدر سب خوش تھے اور ان اشیائے کے ساتھ کتنے قصے وابستہ تھے
ان کو بیان کرتے وہ کس قدر خوش تھے۔ اس کے پس پردہ مال غنیمت کی لوٹ کا نظریہ
کارفرما تھا۔ اس کی تحصیل کے لئے کچھ ہمت درکار تھی۔ جو روبکار لائی گئی تھی۔ اس میں دو
خدشے تھے۔ ایک دشمن کا اور دوسرا اپنے ساتھیوں کا کسی قیمتی مال پر آپس میں مار پیٹ
اور کشت و خون ہو سکتا تھا۔ داد فریاد نہ تھی۔

قیامِ مقُر

منگل ۳۰ اپریل (۱۱ برج ثور) رباط آدہ سے چل کر ایک بجے بعد دوپہر ہم ایک بار پھر مقر آگئے ۔ راستہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی ۔ بستری مریضوں کو کجاووں میں سے اتار کر خیموں کے فرشوں پر لٹا دیا گیا ۔

یکم مئی

آج عسکر کو قندھار سے نکلے پورا سوا ماہ ہو گیا تھا اعلےٰ حضرت نے مشاورتی مجلس میں بہت کوشش کی ۔ کہ وہ تنہا بغیر عسکر قندھار واپس جائے ۔ اور وہاں سے تیار ہو کر واپس مقر آئے ۔ لیکن سرداران متفق نہ ہوئے ۔ ادھر اعلےٰ حضرت کا بہنوئی سردار حسن جان کوشش میں تھا ۔ کہ وہ قندھار جا کر اپنا بوڑھی کا بیٹا دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے خوانین ڈرتے تھے ۔ کہ اعلےٰ حضرت واپس مقر نہ آئے گا ۔ فصل پکنے والی تھی ۔ اور اس کے کاٹنے کے دن قریب آ رہے تھے ۔ خوانین کا متفقہ خیال تھا ۔ کہ وہ سب قندھار لوٹ جائیں ۔ نئی فصل سے حکومت کا خزانہ بھی پُر ہو جائے گا ۔ اور لوگ بھی اپنے گھریلو مزدوری کاموں سے فارغ ہو جائیں گے ۔ اور پھر اطمینان سے دوبارہ لشکر کشی میں شریک ہو جائیں گے ۔ نفری کی کمی پوری کر کے لشکر کی مالی اور نظامی حالت سنواری جا سکے گی ۔ اور دشمن کے مقابلہ کے لئے زیادہ اچھی طرح تیار ہو جائیں گے ۔ مقصد میں تازگی پیدا ہو جائے گی ۔ رفقائے کار بھی واپسی قندھار پر خوش تھے ۔ بہار کا موسم تھا ۔ قندھار کے باغوں کا گھنا سایہ اور ان کے بہترین رس بھرے شیریں شہتوت اُن کو بلا رہے تھے ان کے منہ کا مزا خراب ہو رہا تھا ۔ بعض کا خیال تھا کہ مقام مقر ہا تو سے نہیں جانا چاہئے ۔

اسے اردو گاہ بنا دینا چاہیئے مقر غزنی سے کوئی اسی میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ موجودہ حالت میں محفوظ نہ تھا۔ اس کا گردونواح اور آگا پیچھا دشمن کا تھا۔ ہم مقر میں بیٹھے تھے۔ لیکن اس سے پچھلی رباط آغوجان سے گزرنا محال ہو رہا تھا۔ قندھار سے آمدورفت ابھی تک رکی ہوئی تھی۔

۲ مئی سنہ ۱۹۲۹ء

آج بدھ کا دن تھا۔ رسالہ کے کچھ سوار مقر سے آغوجان گئے۔ تاکہ راستہ صاف کیا جائے۔ سوار کامیاب لوٹے۔ مقامی لوگ مقابلہ میں آئے۔ لیکن تاب نہ لا سکے۔

۳ مئی (۱۴ برج ثور)

آج بھی مقر میں ٹھہرے رہے۔ آج پہلی دفعہ میں نے بچوں کو ہندوستان خط لکھا۔ مجھے بتایا گیا۔ کہ ڈاک قندھار جائے گی۔ آج جرنیل غلام جیلانی خاں سفیر کبیر متعینہ انقرہ متعدد نوجوان فوجی افسروں کے ساتھ مقر پہنچا۔ یہ نوجوان جدید عسکری تعلیم کے لئے ملک ترکیہ گئے ہوئے تھے۔ غلام جیلانی خان جرنیل غلام نبی خان کا بھائی تھا۔ ان کا ایک بھائی غلام صدیق خان تھا تینوں بھائی اعلٰےحضرت کے معتمد اور اُس کے بہت قریب معلوم دیتے تھے۔ ھرات میں مجھے کسی نے بتایا تھا۔ کہ ایک وقت غلام نبی خان صوبہ ہرات میں فوجی کمانڈر رہا۔ اور طبعاً مغرور اور سخت گیر تھا۔ جب فوج نے وہاں بغاوت کی۔ تو اسے ہرات چھوڑنا پڑا۔ فوجی سپاہی اسے ہلاک کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ پایہ حصار کے بلند مضبوط برج میں بہ معہ بال بچوں کے محصور ہو بیٹھا تھا۔ پینے کے پانی کے لئے ترس گیا تھا۔ اس کے خورد معصوم بچے گلوں میں قرآن مجید حمائل کئے باغی سپاہیوں کے پاس رحم کی درخواست لیکر آئے

آخرکار باغیوں نے اِس کو اِس شرط پر راستہ دیا۔ کہ یہ فوراً ہرات سے چلا جائے۔ چنانچہ اس جرنیل نے وہاں سے نکلنے میں دیر نہ لگائی۔

اعلیٰحضرت نے اب فوج کی کمان غلام جیلانی خان کے سپرد کر دی تھی جرنیل صاحب نے نظام کو از سرِ نو ترتیب دینی شروع کر دی۔ دوسرے نو وارد فوجی افسروں کو مختلف شعبے سنبھالے۔ اور وہ تنظیم میں لگ گئے۔ آج کے دن جو سپاہی غزنی کے مورچوں پر پیچھے رہ گئے تھے۔ بچتے بچاتے مستقر پہنچے۔

۴ رمئی کا دِن

اب کوئی نہ کوئی موٹر لاری قندھار سے آجاتی۔ یہاں سے کوئی فرد بلا اجازت قندھار نہ جا سکتا تھا۔ آج جب کہ بارگیری کے شتر باہر پڑاؤ سے دور چر رہے تھے۔ تو ان میں سے کچھ لاپتہ ہو گئے۔ ان کی تلاش سے سوار ناکام لوٹے۔ آج اعلیٰحضرت بھی سہ منزلہ عمارت کی چھت پر کھڑا دوربین لئے مستقر کے گرد و نواح کی چھان بین کرتے دیکھا گیا۔

۵ رمئی کا دِن

سنا گیا۔ آج کچھ اور اونٹ اور کچھ گھوڑے جاتے رہے۔ سراغ نہ ملا۔ یہ کہنا محال تھا۔ کہ اس میں صرف دشمن کا ہاتھ تھا۔ خود خرکاران غالباً اس کے ذمہ دار تھے۔ یہ خوراک کی تنگی سے تنگ آکر پوشیدہ طور پر اپنے مال کو اِدھر اُدھر کر رہے تھے خرکار خود تنگ دست ہو چکے تھے۔ اور اب کام کو بیگار سمجھنے لگے تھے۔ ان کے جانور لاغر ہو چکے تھے۔

۶ مئی (۱۷ برجِ ثور)

آج کا دن بھی منقر ہی میں گزرا۔ قندھار سے پہلی ڈاک آئی۔ مجھے ایک خط ملا۔ خزانہ قندھار سے سنا گیا کچھ روپیہ بھی آیا۔ شام کے وقت اچک زئیوں نے اعلےٰ حضرت کی قیام گاہ کے سامنے قومی رتن (ناچ) رچایا وہ خوب ناچے اور انہوں نے جی بھر کر گیت گائے۔ ان کا سردار نظر محمد خان گرد تھا۔ یہ چمن کی سرحد کے قریب سے اپنے لوگ بطورِ کمک ہمراہ لایا تھا۔ لیکن غزنی نہ پہنچ سکا تھا۔ اور نہ ہم میں مل سکا۔ لہٰذا منقر ہی میں ٹھہر گیا تھا۔ سنا یہ گیا۔ کہ یہ دستہ رباط آوبہ تک آگے بڑھ سکا تھا۔ اس کو منقر نہ چھوڑنے کے لئے لوگوں نے مشورہ دیا تھا۔ کیونکہ آوبہ خطرہ سے خالی تھا۔ لیکن ہر قیمت پر وہ غزنی پہنچنے کے لئے مُصر ہوا۔ جب وہ رباط آوبہ میں داخل ہو گیا۔ تو اس علاقہ کے لوگوں نے رباط کو محاصرہ میں لے لیا۔ اور اگر قدرت اس کی مدد نہ کرتی۔ تو اس کا ایک آدمی بھی واپس منقر نہ پہنچتا۔ رباط میں اب پانی نہ تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ان بے چاروں کی زبانیں سوکھ کر کھانٹے بننے لگیں۔ خدا مہربان ہوا۔ ابر کے ایک ناگہانی ٹکڑے نے ان بے چاروں کے حلق تر کر دیئے۔ اور یہ غریب لڑتے بھڑتے واپس منقر آ گئے۔ یہاں منقر کو یہ لوگ مضبوط بنائے بیٹھے ہیں۔ اور دشمن کو نیچا دکھاتے رہے۔ یہاں منقر میں میں خود بیمار ہو گیا۔ پانی خراب ہو گیا تھا۔ اور فضا گندی ہو چکی تھی۔

منقر خالی کر دیا

ہم گیارہ مئی تک منقر میں ٹھہرے رہے۔ ۱۲ مئی (۲۲ برج ثور) کو ہم نے منقر چھوڑ دیا۔ اور دوپہر کے وقت رباط آنوجان جا پہنچے۔ آج اعلےٰ حضرت کی طبیعت قدرے

ناساز تھی۔ اگلے دن ۱۳ رمئی کو صبح یہاں سے چل کر رباط شاہ جو پہنچے۔ یہاں کچھ وزیری مہاجر رہتے تھے۔ اور یہ ہمارے حلیف تھے۔ اور سنا کہ ان میں سے بعض ہمارے ساتھ غزنی تک گئے تھے۔ راستہ میں صرف ایک گاؤں سے گولی چلی۔ موسم اب خاصا گرم تھا۔ ایک وزیری نے ترش چھاچھ پلائی۔ یہاں پر ایک عمدہ چھوٹا سا باغ تھا جس کے درخت اس وقت ہرے بھرے تھے۔

۱۴ رمئی

شاہ جو سے چل کر رباط تازی پہنچے۔ شاہ جو کے کچھ وزیری بھی بال بچوں سمیت ہمارے ہمراہ ہو لئے تھے۔ وہ ڈرتے تھے۔ کہ گرد و نواح کے لوگ ان کو اب زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اس رباط کے پاس سے ایک میٹھے پانی کی جو بہ رہی تھی۔ یہ شاید دریائے ترنک سے نکالی ہوئی ہو گی میرے خیمہ کے بالکل قریب ہی شوقیہ دو قندھاری نوجوان کشتی لڑنے لگے۔ افغان ہندوستانیوں کی طرح کشتی نہیں لڑتے۔ وہ ننگے نہ تھے۔ کُرتہ اور پاجامہ میں تھے۔ گھٹنے بھی ننگے نہ تھے۔ انہوں نے شلواریں اونچی ٹھانک لی تھیں۔ دونوں نے کمر میں ایک ایک مضبوط دوپٹہ باندھ لیا تھا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کے کمربند میں اپنے ہاتھ اڑا لئے تھے۔ اب ان میں سے ہر ایک کوشش میں تھا۔ کہ وہ اپنے مدمقابل کو زمین سے اٹھا کر زمین پر پٹک دے جس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے۔ وہ ہار گیا۔ جو مریض زیادہ لاچار تھے۔ ان کو موٹر لاری میں لٹا کر قلات روانہ کر دیا گیا۔

۱۵ رمئی (دیگرھ)

رباط تازی سے چل کر رباط مراپ پہنچے۔ یہ رباط ایک پر فضا وادی میں کھڑی تھی۔

سبز لہراتے کھیت تھے - اور دریائے ترنک کے پانی سے سیراب ہوتے تھے - لب آب ممدود جو خیموں کے پاس سے بل کھاتی جارہی تھی - آج جرنیل غلام جیلانی خان کی طبیعت ناساز تھی۔ مجھ سے دریافت کیا۔ کہ طبی امداد کی اصلاح کس طرح ہونی چاہیئے۔ جرنیل خندہ پیشانی شخص نہ تھا۔ خودپسند اور بدرجۂ اتم حکومت پسند معلوم دیتا تھا۔ خُوبُو میں آمرانہ - اس کے اپنے ملازمین بھی اس سے ہراساں نظر آتے تھے۔ بہت آہستہ اور بہت کم گفتگو کرتا۔ بود و باش اور لباس میں بے داغ ستھرا تھا۔ شام کے قریب میں نے ایک شخص کو اپنے خیمہ کے نزدیک معمولی کابلی دھسہ اوڑھے کرتہ پاجامہ میں ٹہلتے دیکھا۔ معلوم ہوا۔ کہ عبدالہادی خان تھا جو کابل میں وزیر تھا۔ اور اس سے پہلے کچھ عرصہ جرمنی میں سفیر رہ چکا تھا۔ اور اب قندھار سے آکر اردو میں شامل ہوا تھا۔ پریشان سا تھا۔ شام کو مطلع ابر آلودہ ہوگیا۔ کچھ بوندا باندی ہوئی اور جھکڑ غضب کا چلا -

ہم واپس قلات پہنچ گئے

اب ہم بروز جمعرات ۱۶ رمئی (۲۷ برج ثور) کو گیارہ بجے دن قلات بخیر و خوبی پہنچ گئے راستہ پُر امن تھا۔ اعلےٰحضرت خود باغ کی کوٹھی میں قیام پذیر ہوا۔ اور اردگرد خواص و گارڈ کے خیمے نصب ہوئے۔ باغ کے اندر بڑا دروازہ کے قریب ہی لب سڑک میں نے اپنا خیمہ لگوایا۔ دروازہ سے فوری باہر رسالہ قراہ کے گھوڑے سے سوار خیمہ زن ہوئے۔ اور باہر غزنی کی جانب سڑک کے آر پار رضاکار لشکر اور دوسرا نظام ٹھہر گئے۔ فوجی شفاخانہ اوپر قلعہ میں چلا گیا۔ بظاہر کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔ ہر چیز معمول پر رواں دواں نظر آتی تھی۔ قندھار اور قلات کے درمیان آمدورفت بے خطر اور آسان تھی۔ صرف ۸۰ میل کا فاصلہ درمیان میں تھا -

۱۷ر مئی

عام خیال تھا۔ کہ یہاں سے اب سپاہ پیچھے نہ ہٹے گی۔ قلات فوجی اڈا یعنی مرکز بن جائیگا۔ اور یہاں ہی سے دوبارہ غزنی پر چڑھائی ہو گی۔ مجھے بھی احکام ملے۔ کہ شفاخانہ کے لئے ضروری ادویات اور دوسرے لوازمات کی فہرست پیش کر دوں۔ شعبہ صحت اب ایک افسر انتظامیہ کے سپرد ہو چکا تھا۔ جو مجھے مقر میں ایک دفعہ مل چکا تھا۔ نئے نئے احکام جاری ہونے لگے۔ کاغذ پر نظام کی از سرِ نو تنظیم شروع کر دی گئی تھی۔ لیکن قندھار سے کوئی نیا سپاہی نہ آیا۔ اور نہ ہی گولہ بارود۔ گولہ بارود تو غالباً وہاں ہو گا ہی نہیں۔ پھر آتا کہاں سے۔ اگر باہر سے آتا تو چمن کے راستہ آتا۔ لیکن اس دروازہ پر تو انگریز پہرہ دار بیٹھا تھا۔ جو عام خیال کے مطابق اس کھیل کا بانی تھا۔

۱۸ر مئی (۲۹ ثور)

آج کا دن بھی قلات میں گزرا۔ قندھار سے ڈاک آئی۔ عسکر کا کچھ حصہ دشمن کی روک کیلئے قلات سے گیا۔ قندھار سے کوئی نئی کمک نہ پہنچی۔ ۱۰ بجے پاس کا گاؤں دیکھا۔ دریائے ترنک جو گاؤں کے ساتھ ہی بہ رہا تھا۔ خشک پایا۔ گاؤں کے ایک طرف ایک جُو بہہ رہی تھی۔ اس میں پانی کی مقدار خاصی تھی۔ سپاہی لوگ اس میں نہاتے اور کپڑے دھوتے۔ واپسی پر بیس تیس یابو چمن کی طرف جاتے دیکھے۔ یہ عام سڑک کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ چمن جانے کا تھا۔ خرکار نے بتایا کہ چمن اس راستہ سے نزدیک پڑتا تھا۔ چنانچہ قلات سے چمن پہنچنے کے لئے دو راستے تھے۔ ایک وہ جو قندھار کو جاتا تھا۔ اور یہ شاہراہ عام سڑک تھی۔ اور دوسرا پگڈنڈی کی شکل کا پہاڑی راستہ جو سیدھا چمن کو جاتا تھا۔ یہ چھوٹا راستہ فاصلہ میں کم تھا۔

بڑی عید

سوموار ۲۰ مئی (۱۳ برج ثور ۱۳۲۸ھ) آج عید الضحیٰ کا دن ہے۔ اور ہم قلات میں ہی مقیم ہیں۔ نماز کی ادائیگی کے لئے باغ سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر دو شامیانے جوڑ کر لگائے گئے تھے۔ صبح ۸ بجے سے پہلے ہی سپاہیوں کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے عیدگاہ نمازیوں سے بھر گئی۔ پونے ۹ بجے اعلیٰ حضرت آیا۔ آتے ہی امام کو چوغہ پہنایا۔ اور لنگی سر پہ بندھوائی۔ اسی لباس میں امام نے نماز پڑھائی۔ نماز سے پہلے اعلیٰ حضرت منبر پر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑے ہو کر اس نے تقریر کی۔ لب لباب یہ مقصود تھا۔ میں بھائیوں کی ہمت اور شجاعت کی قدر کرتا ہوں۔ اور ان کے ایثار اور قربانی کا ممنون ہوں۔ مجھے خوشی ہو گی۔ کہ ان قربانیوں کی تلافی کروں۔ جو میری اور اپنے ملکِ عزیز کی خاطر انہوں نے بے دریغ کی ہیں۔ شہدا کے ورثا کیلئے وظائف مقرر ہوں گے۔ جو مجروح ہو کر معاش کے قابل نہیں رہے۔ ان کی روزی بھی وظائف کی شکل میں منظور ہو گی۔ جو اپنا کاروبار کر سکتے ہیں۔ ان کا حق بھی ادا کیا جائے گا۔ اس بڑی عید کی یاد کو تازہ رکھنے کی خاطر ہر اس فرد کو جو اس وقت قلات میں میرے ساتھ موجود ہے۔ آئندہ ہر عید الضحیٰ کے دن حکومت کی طرف سے پچاس روپیہ بطورِ عیدی دیئے جایا کریں گے۔ خدا ہماری محنت ٹھکانے لگائے۔ میری دلی خواہش ہے۔ کہ اپنے رفقائے کار کو جو میری خوشی اور غمی میں شامل ہیں۔ ہمیشہ اور ہمیشہ خوشحال دیکھوں۔ حاضرین یک زبان ہو کر بولے۔ جان گیا، ہمارا مال اور اولاد سب کچھ آپ کے قدموں پر نثار ہیں۔ ہم اب قلات سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ خدا ہمارا ساتھ دے یا چار یار۔ (ہندوستانی مسلمان نعرۂ تکبیر لگانے کے عادی ہیں۔ اور قندھاری لوگ نعرۂ چار یار کے۔ کیونکہ ہند میں مسلمانوں کا مقابلہ مشرکین سے ہے۔ اور قندھار میں اہلِ سُنت کا مقابلہ اہلِ تشیع سے ہے) فضا میں طیارہ کی گونج اٹھی۔ اب یہ شامیانہ پر پہنچ گیا۔ نیچا آ کر عید کی خوشی میں

قندھار سے مبارکبادی کے جو پھول ساتھ لایا تھا۔ برسا رہا تھا۔ پھر اس نے فضا سے زمین پر اترے بغیر ایک گٹھڑی نیچے زمین پر پھینکی۔ اعلیٰحضرت نے بڑی بے چینی سے منبر کے قریب ہی اسے اپنے ہاتھوں سے کھولا۔ اور کچھ پڑھا۔ اب نماز پڑھائی گئی۔ تقریب عید کی خوشی میں سلامی کی توپیں قلعہ کی فصیل سے داغی گئیں۔ لوگ واپس اپنے خیموں میں پہنچ گئے۔ اور قربانی میں مصروف ہوگئے آج کی تقریر بے اثر نہ گئی۔ لوگ خوش تھے۔ میں نے سوچا کاش! اعلیٰحضرت دوبارہ کابل میں تختِ افغانستان کو زینت بخشیں۔ کیا مجھے بھی اس عید سعید کی یاد میں کچھ رقم اس ملک سے ہند جایا کرے گی۔ اور میں کس قدر مسرور و مفتخر ہوں گا۔ پھولے میں نہیں سماؤں گا۔ کہوں گا: یہ ایک وقت کی میری محنت میری وفاداری اور جانفشانی کا ثمر ہے۔ اور میری اولاد۔ اور میرے بہی خواہ بھی اس میں میرے برابر کے شریک ہوں گے۔

مجھے احساس ہوا۔ کہ میں ایک بڑے تاریخی ڈرامہ کو دیکھ رہا ہوں۔ بلکہ اس میں ایک ادنیٰ سا پارٹ بھی ادا کر رہا ہوں۔ اس ڈرامہ کی روئیداد دنیا کی تاریخ کے ایک ورق پر ہمیشہ کے لئے لکھی ہوگی۔ اور اس کو آنیوالی نسلیں پڑھینگیں۔ اور میں ہوں کہ خود اپنی آنکھوں سے ایک خاندان میں بادشاہت کو سنورتے اور بگڑتے دیکھ رہا ہوں۔ ایسے واقعات بارہا تاریخوں کی ورق گردانی میں بڑے شد و مد سے پڑھے تھے۔ وہ بڑے مہیب اور قیاس سے باہر اور بالاتر نظر آتے تھے۔ بڑی بڑی خوفناک جدالیں اور لرزہ خیز معرکے۔ ہزار ملکہ لاکھوں خون جن پر لاتعداد گھرانوں کی خوشی اور آبادی کا انحصار ہوتا۔ میدان جنگ میں بے جان لاشوں کے ڈھیر بن کر رہ جاتے ان کی لاشیں جو زبان امن میں ہزار ادب و احترام کی حقدار بھی جاتیں۔ بسا اوقات روندی اور چیل و کوؤں کے لئے آفتاب کی تپش میں سڑنے گلنے کے لئے چھوڑ دی جاتیں۔ اور ان کی اور کتے بلے کی لاشوں میں کوئی تمیز نہ رہتی۔ جوان عورتیں بیوائیں اور مائیں بے لال بن کر رہ جاتیں۔

اور بچے یتیم اور بے نوا ہو کر روٹی کپڑا کے لئے ترستے پھرتے۔ میں آج کئی چہرے نہ دیکھ رہا تھا غالباً اُن کا حشر بھی جداگانہ نہ تھا۔ اور اُن کے ورثا کا حشر بھی قریب قریب وہی پرانا تھا۔ جو قدیم کی جنگوں کے نتیجہ میں ہوتا۔ موت وہی تھی اور اس کا اثر اور نتیجہ وہی۔ جو مر گیا اس کے لئے کھیل ختم ہو گیا۔ اور دنیا تاریک۔ اور جو کھیل رہے تھے۔ وہ اس حشر کے نتائج سے غافل اور بے بہرہ ایک نشہ میں ابھی مخمور تھے۔

کیا یہ سب کچھ کھیل نہ تھا۔ محض بخت آزمائی اور انتقام کا کھیل۔ ہم سب نے کیا ایک فرد کی خوشی اور غمی میں سب کچھ داؤ پر نہ لگا رکھا تھا۔ یا ہم خود غرض تھے۔ اور یہ سب کچھ اپنے نفس اور روح کی پرورش اور آسائش اور آسودگی کے لئے کر رہے تھے۔ شاید بعض کا نظریہ وطن پرستی بھی ہو۔ جُوا تھا۔ جو جیت جائے گا۔ سب کچھ سمیٹ کر دامن بھر لے گا۔ باختہ جائے جہنم میں۔

ایک انسان کام سے تھک کر اور چور چور ہو کر سو جاتا ہے۔ خاندان ابھر کر اور چمک کر سو جاتے ہیں۔ تو میں ایک کردار ادا کرنے کے بعد محوِ خواب ہو جاتی ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا خاندان اس اصولِ قدرت سے مُستثنےٰ نہ تھا۔ ہر فرد اور ہر قوم نے قدرت کے منصوبہ کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ قدرت نے ایک منصوبہ کے تحت اُس زمین کو پیدا کیا اور اُس کے منصوبہ کے مطابق ہی یہ آباد رہی ہے۔ فرد قدرت کا ایک مزدور اور کاریگر ہے۔ اس کا کام قدرت کے بنائے ہوئے نقشہ پر عمل کرنا ہے۔ کہیں شکست و ریخت کا کام ہے۔ اور کہیں تعمیر جدید کا۔ کہیں ایک فاتح قوم استاد کی طرح سختی اور نرمی سے پس افتادہ محکوم قوم کو درسِ نو دینی ہے محکوم بمنزلہ ایک شاگرد کے ہے۔ اور حاکم فاتح قدرت کا منتخب شدہ استاد کہیں یہ فاتح منشاء قدرت کے تحت ایک کج رفتار نہ سُدھرنے والی محکوم قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔

فاتح اور محکوم کے خون ملتے ہیں۔ اور اس آمیزش سے ایک نئی خلق وجود میں آتی ہے۔ جو تو ام فعل میں وقت کے تقاضا کو پورا کرتی ہے۔

اپنے منصوبہ ارتقا کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے یہی دانا قدرت ہمیشہ مصروفِ عمل رہتی ہے۔ اور بغیر کسی رُو رعایت اپنے اس فعل کو مصروفِ کار رکھتی ہے، یہ تعین اس طرح ہے۔ جیسے ادنیٰ پیمانہ پر قدرت کا کاریگر انسان نئی نئی آمیزشی تراکیب سے نئے نئے پھل اور پھول خلق کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اور منشاء وقت کے مطابق بحر و بر اور فضا میں اور زیرِ زمین نت نئی تعمیر میں لگا رہتا ہے۔ قدرت کا صناعِ دستِ غیب اس اپنے کاریگر کو تقاضائے وقت سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ اور اُس سے اِس اپنی زمین کی آبادی کا کام لیتا ہے۔

یوں تو آج لوگ مطمئن تھے۔ اگر وہ میدانِ کارزار میں کام آ گئے۔ یا روٹی کمانے کے قابل نہ رہے۔ تو ان کا اور ان کی اولاد کا پیٹ بھرتا رہے گا۔ ان کی اولاد کسی غیر کے آگے دستِ سوال نہ بڑھائے گی۔ ان کی پرورش خود ان کے اپنے گھروں میں ہو گی۔ اور ان کی نگران خود اپنی اُن کی مائیں ہوں گی۔ وہ اپنی ماؤں کے سایۂ شفقت سے محروم نہیں ہوں گے۔

دوپہر کے بعد سید و خان بھی اپنے رضا کاروں کا دستہ لے کر دشمن کے مقابلہ میں اردو گاہ سے کچھ دور مورچہ میں جا بیٹھا۔ سنا گیا۔ کہ دشمن ایک طاقتور جمعیت کے ساتھ اور بھاری توپیں لئے ہوئے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا۔ کہ ہم بُری طرح غزنی میں شکست سے دوچار ہو چکے تھے۔ ورنہ دشمن کا حوصلہ اتنا بلند کیسے ہو سکتا تھا؟ اور یہ کہ اُس کے خیال میں اُس کا پلڑا بھاری تھا۔ اور ہم اب مدافعت کے قابل نہ رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے سپاہی دشمن کی بھاری توپوں کی گولہ باری سے خائف ضرور تھے۔ ۱۸۰ پن اور ۳۶ پن ہر ایک کی زبان پر تھا۔

دشمن کا قلات پر حملہ اور اعلیٰحضرت کا قلات سے فرار

۲۱ رمئی ۔ آج کے دن سنا گیا ۔ کہ دشمن رباط ہراسپ پہنچ چکا تھا ۔ اور اُن کے ہمراہ ہمارے حریف قبائل کے غلزئی لوگ بھی آرہے تھے ۔ ان میں سے بعض جذبہ انتقام میں اندھے ہم پر ٹوٹ پڑنے کیلئے بیتاب تھے ۔ وہ علاقہ قندھار کو چھوڑ کرنے پر تُلے آرہے تھے ۔

۲۲ رمئی (۲ برج جوزہ) چہارشنبہ کا یوم تھا ۔ ابھی صبح سویرا تھا ۔ میرے ملنے والے مدرس محمد عظیم خان میرے پاس آئے ۔ آپ کوئٹہ کے فارغ التحصیل تھے ۔ عمر کی ۴۵ بہاریں دیکھ چکے تھے ۔ اور ایک آنکھ سے محروم تھے ۔ جذبہ خدمتِ وطن میں ہندوستانی بودوباش کو خیرباد ۔ کہہ کر اپنے آبائی وطن قندھار میں آگئے ہوئے تھے ۔ اور ایک سکول میں ایک مدرس کی خدمت انجام دے رہے تھے ۔ ایک عام رضاکار سپاہی تھے ۔ کہنے لگے کیسے بے خبر سو رہے ہو ۔ ذرا خیمہ سے باہر نکلو تو دیکھو ۔ شاہی خیمے گر رہے ہیں ۔ میں نے کہا ۔ خیر تو ہے ۔ بولے دشمن سر پر آپہنچا ہے ۔ اور اعلیٰحضرت قلات چھوڑ رہا ہے ۔ موٹر کار تیار کھڑی ہے ۔ ابھی چند منٹوں میں سوار ہو جائیگا ۔ ایک دو موٹر لاریوں کا انتظار ہے ۔ میں نے کہا تو کیا کل کی تقریر بے معنی تھی ۔ کل کا دم خم اور عزم و حزم کہاں چل بسے ۔ باہر خیمہ سے نکل کر دیکھا ۔ تو اعلیٰحضرت تیار کھڑا ٹہل رہا تھا ۔ اور انداز بے تابانہ تھا ۔ بیتابی میں ایک دو قدم ٹہل لیتا ۔ اور پھر کھڑا ہو جاتا ۔ اور ادھر ادھر نگاہ دوڑاتا ۔ پھر ٹہلنے لگ جاتا ۔ کچھ خیمے خالی ہو رہے تھے ۔ ایک افسر جو میرے قریب سڑک پر کھڑا تھا ۔ دوسرے سے بولا ۔ بھائی کچھ اپنی فکر بھی تو کرو ۔ جس کے لئے آئے تھے دیکھو تو وہ جارہا ہے ۔ میں فوراً اپنے خیمہ کے اندر آیا ۔ اور جانے کی تیاری میں لگ گیا ۔ صرف ایک ہینڈ بیگ سنبھالا اور باقی سب کچھ اللہ کے سپرد کیا ۔ اور بغیر پوچھے یا اجازت لئے ہمت کی ۔ اور ایک لاری میں جواب میرے خیمہ کے قریب آکر رکی کھڑی تھی ۔ ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی سیٹ پر براجمان ہو بیٹھا ۔ اور سوچنے لگا ۔ اگر مجھ سے پوچھا گیا ۔ کہ بھلے مانس تم کہاں جارہے ہو ۔ تو میرا جواب کیا

ہو گا۔ پھر مجھے فکر لاحق ہوئی۔ کہ میں بغیر حکم اور اشارہ خود بخود اس حرکت یا غیر حرکت کے مقصد اور انجام سے بے آگاہ ایسا قدم اٹھا رہا ہوں۔ جس میں علاوہ بے آبروئی کسی سزا اور جزا کا مستوجب بن سکتا ہوں۔ خدا نہ کرے کسی الجھن اور مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ میرے پاس بظاہر کوئی جواز نہ تھا۔ میری پوزیشن کمزور تھی۔ مجھے بالکل علم نہ تھا۔ کہ ان جا رہا ہے۔ کہاں اور کیوں۔ میرے پاس ایک کمزور سی دلیل تھی۔ اور تجاہل عارفانہ برت کر کہہ سکتا تھا۔ کہ بندہ ڈاکٹر ہمرکاب اعلےٰ حضرت کی سندِ تقرری اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اور پھر میں ایک اجنبی ہوں اور مدد کا مستحق۔ لیکن وقت کچھ اسقدر نازک اور ہیبت ناک تھا۔ کہ مجھے اپنی جان کا ڈر پریشان کئے جا رہا تھا۔ راستہ میں میری موجودگی کا علم ضرور ہو جائیگا۔ اور اگر مجھے راستہ میں اتار دیا گیا۔ تو پھر میرا کیا حشر ہو گا۔ میں نے آخر الذکر کا علاج یوں سوچا۔ کہ اپنے ملازم عبدل کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اور اسے کہہ دیا۔ کہ جب لاری چلنے لگے۔ تو پائیدان پر ہی بیٹھنے کی کرے۔ اور کہیں اسے جگہ بھی کیسے ملنی تھی۔ لاری کا ڈرائیور گلکھڑ میرا جان پہچان لوٹھودار کا باشندہ تھا۔ وہ مجھے کیسے نہ کہہ سکتا تھا۔ پھر اُسے اِس سے مطلب ہی کیا۔ اور پھر پردیس میں قدرتی طور پر ہم وطنی کا پاس تھا۔ اور میری جان پہچان ہی اسی بنیاد پر ہوئی تھی۔ اللہ کا احسان تھا۔ کہ مجھے پریشانی سے بچا لیا۔ اب لاری میں اعلےٰ حضرت کا خالہ زاد بھائی۔ سوتیلا بھائی اور تین چار فوجی افسر جن کا غالباً شاہی خاندان سے تعلق تھا۔ پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ اور شاید ملکہ ثریا کا بھائی بھی ان میں شامل تھا۔ کسی نے اعتراض نہ کیا۔ اور نہ ایسا کرنے کی کسی کو فرصت تھی۔ کچھ وقت کی تنگی کے خیال سے اور کچھ اوروں کی آنکھوں سے بچنے کی وجہ سے۔ یکایک اعلےٰ حضرت کی کار میری لاری کے پاس سے گزر کر باغ کے دروازہ میں پہنچ گئی۔ کار میں وزیر دربار۔ عبدالہادی خان اور سردار عنایت اللہ خاں سوار تھے۔ اس کے پیچھے فوجی سپاہیوں سے بھری ہوئی ایک لاری جو غالباً رسالہ شاہی کے سوار تھے۔ نکلی اس کے پیچھے ایک لاری نما کار نکلی۔ اس میں سولہ سالہ نوجوان سردار خلیل اللہ جان، اور اعلےٰ حضرت کا

ذاتی ناظر اگلے حصہ میں بیٹھے تھے۔ اور پچھلے نصف میں بظاہر لٹر پٹر سامان بھر رکھا تھا۔ اس کے پیچھے پہلی لاری چلی۔ اور ہمارے پیچھے آخری لاری۔ جس میں پھر فوجی سپاہی بھرے تھے چلی۔ ہم چند لمحوں میں ہی سپاہ کے درمیان سے نکل گئے تھے۔ سپاہی خیموں سے باہر اور سڑک کے کنارے کھڑے ہکا بکا سے یہ تماشہ دیکھتے رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوا چند منٹوں میں ہی ہم بیسیوں میل دور نکل گئے تھے۔ مجھے ایسا محسوس دیتا۔ کہ ہم پر اب گولی چلی کہ اب گولی چلی۔

رباط تیر انداز کے قریب سڑک پر ایک بار سب موٹریں رک گئیں۔ وزیر دربار نیچے اترا۔ اور گاڑیوں میں آنے والوں کو بغور دیکھا۔ یہ وقت بہت نازک تھا۔ کچھ نہ بولا۔ البتہ میرے ملازم کا دریافت کیا ہم پھر چل پڑے۔ اس گروہ میں نہ تو عبدالواحد خان تھا۔ اور نہ ہی سردار حسن جان۔ اب ہم قندھار سے کوئی بیس پچیس میل دور رہ گئے تھے۔ یہاں دیکھا۔ کہ ایک موٹر کار قندھار کی طرف سے اڑی چلی آرہی تھی۔ یہ قریب آکر رک گئی۔ اس میں ٹیلیفون انسپکٹر اور اس کا معاون سوار تھے۔ انسپکٹر ہندوستانی معلوم دیا۔ پشاوری لباس میں تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قوم کا آفریدی تھا۔ اور انگریز کی ملازمت چھوڑ کر یہاں ملازم ہو گیا تھا۔ اعلےٰ حضرت کے ہاتھ میں اس نے ایک سفری ٹیلیفون دیا۔ اور کھمبے کے تار سے اس کی تار جوڑ دی۔ اب اعلےٰ حضرت ٹیلیفون پر گفتگو میں لگ گیا۔ ہم اپنی گاڑی میں بدستور بیٹھے رہے۔ غالباً اعلےٰ حضرت نے اپنے حرم میں اپنے آنے کی اطلاع بھی کی ہو گی۔ اور اپنے اعتباری کارداروں کو کچھ ہدایات بھی دی ہوں گی۔

اب گاڑیاں ایک بار اور سڑک کو لپیٹنے اور سمیٹنے لگیں۔ اور ہم بہت جلد ہی رباط قندھار پہنچ گئے۔ رباط سے باہر سڑک پر اعلےٰ حضرت ٹیلیفون پر باتوں میں پھر مشغول ہو گیا۔ وہ لب سڑک پاؤں پر اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ بائیں ہاتھ میں ٹیلیفون کا ریسیور تھا۔ اور دائیں ہاتھ سے غیر شعوری طور پر سڑک کی کنکریوں کو الٹا پلٹا رہا تھا۔ ٹیلیفون کے عمل سے فارغ ہو کر رباط کے اندر چلا گیا۔ اور ساتھ ہی کار کے

مسافر بھی اندر چلے گئے۔ باقی سب بدستور گاڑیوں میں بیٹھے رہے۔ لاری کی چھت گرم ہو رہی تھی۔ آفریدی ٹیلیفون انسپکٹر رباط کے اندر گیا۔ اور اپنے ٹیلیفون اپریٹر سے جو رباط کے اندر خدمت پر مامور تھا۔ دوپہر کا کھانا تیار کروایا۔ ہم دو تین افراد اس کے ہمراہ اپریٹر کے کمرہ میں گئے۔ اور فرش پر بیٹھ کر کھانا سے لطف اندوز ہوئے۔ اعلیٰ حضرت اور اس کے رفقاء رباط کی مسجد میں پناہگزین تھے۔ آفتاب تیزی پر تھا۔ ہم باہر آئے اور رباط کی بلند دیوار کے سایہ میں سستانے لگے۔ دوپہر دو بجے کے قریب محمد عمر جان خلیفہ دہ خوجہ ایک کار میں سوار قسلات کی جانب سے آرہا تھا۔ اس کے ہمراہ اخبار "طلوع افغان" کا مدیر اور ولایت قندھار کے ڈاکخانہ جات کا مدیر تھے۔ یہ لوگ رباط سے پرے ہی ٹھہر گئے تھے۔ خلیفہ دہ خوجہ کو رباط کے اندر بلا لیا ہوا۔ اور اسے قندھار کی سمت آگے بڑھنے سے روک دیا گیا۔ باہر آکر خلیفہ نے نماز ظہر دیوار کے سایہ میں ادا کی۔ اور پھر قسلات کی سمت لوٹ گیا۔ اب رباط مہمند کے قریب سڑک پر دو سپاہی متعین کر دیئے گئے تھے۔ اور یہ کسی کو قندھار کی طرف نہ جانے دیتے تھے۔ سڑک پر آمد و رفت بند ہو گئی تھی۔

کوئی تین بجے بعد دوپہر ایک موٹر کار قندھار کی طرف سے آئی۔ اس سے سردار علی احمد جان اعلیٰ حضرت کا بہنوئی اترا۔ اور اعلیٰ حضرت کے پاس پہنچ گیا۔ اعلیٰ حضرت اس وقت رباط سے باہر کھڑا اس کے انتظار میں تھا۔ سردار جھکا اور اعلیٰ حضرت کے پاؤں چھونے کو تھا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے اس کو تھام لیا۔ اور پھر دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پھر سردار اپنی موٹر میں سوار ہو کر جانب قسلات روانہ ہو گیا۔ چار بجے کے بعد رباط کے اندر جانے کا موقع ملا۔ اعلیٰ حضرت غالباً مسجد میں تھا۔ اور باہر صحن میں احمد علی خان رئیس تنظیمیہ دُنبہ کا گوشت آگ پر بھون رہا تھا۔ کچھ تیار ہو چکا تھا۔ اسے مسجد کے اندر بھیج دیا۔ جب شام ذرا تاریک ہو گئی۔ تو اعلیٰ حضرت اپنے رفقاء خاص کے ساتھ رباط سے باہر آیا۔ اور چہل قدمی میں لگ گیا۔ میں باہر کاریز کے کنارہ پر بیٹھ گیا۔ ہر قدر جستجو کی اور فکر دوڑائی۔ لیکن پروگرام سے آگاہی نہ ہوئی۔ بظاہر معلوم یہی دیتا تھا۔ کہ یہ پارٹی اندھیرا کے انتظار میں تھی۔ اور اس نیت کا پردہ اوڑھے قندھار میں وارد

ہو گی۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے ایک لاری قلات کی طرف سے آئی۔ اس میں زخمی مولوی محمد یار خاں لیٹا ہوا تھا۔
یہ سردار غزنی کی لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا۔ اسے رباط میں اتار لیا گیا۔ مولوی صاحب چونکہ گھوڑے پر سوار نہ ہو
سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی اجازت سے ایک بار میں نے ایک پڑاؤ شاہ جو تک اس کے سیاہ گھوڑے پر سفر کیا
تھا۔ اس روز یہ گھوڑا مجھے میری کوشش کے برعکس کشاں کشاں منزل پر سب سے پہلے لے آیا تھا۔ اس دن کے سفر سے
میں بالکل نہ تھکا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے میں خوب لطف اندوز ہوا تھا۔ جسم میں دبلا مگر طاقت میں شاہ زور گھوڑا
تھا۔ اس دن خوش قسمتی سے مجھے اعلیٰ حضرت کا چھوٹا سوتیلا بھائی جو اس وقت ٹولہ مشر تھا۔ اس کا اردو
اور نظامی افسروں کا ساتھ مل گیا تھا۔

رات کے اب گیارہ بج گئے۔ لیکن ہم سب ابھی وہیں جمے بیٹھے تھے۔ نصب العین واضح نہ تھا۔ رباط سے
باہر زمین پر چادر بچھائی۔ اور میں اس پر لیٹ گیا۔ میرے ملازم نے بتایا کہ یہاں پر لیٹنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔
اس سرزمین میں بچھو اور شتر کن بہتات میں تھے۔ شتر کن ایک قسم کا مکڑا تھا۔ جو چڑیا کے بلے پر لوٹ سے
ملتا جلتا تھا۔ اس کی بابت مشہور تھا۔ کہ یہ اگر اونٹ کو کاٹ لے تو اونٹ مر جاتا ہے۔ ہرات میں ایک بار
میں نے اس کی اور بچھو کی لڑائی دیکھی تھی۔ سپیرا نے ایک بچھو اور ایک شتر کن کو چینی کے پیالہ میں چھوڑ دیا تھا۔
آگے آگے بچھو دوڑ رہا تھا۔ اور اس کے دنبال میں یہ شتر کن۔ کچھ منٹ چکر چلتا رہا۔ پھر شتر کن نے بچھو کی دم اپنے
منہ میں پکڑ لی۔ ڈنگ سے ذرا نیچے۔ ڈنک یعنی نیش کٹ کر پیالی میں گر گیا۔ اب شتر کن کو قبل ازیں کہ وہ کچھ
اور فعل کرتا سپیرا نے کھیل ختم کر دی۔ دونوں کو نکال کر اپنے برتنوں میں بند کر لیا۔ اس نے اتنا بتایا۔ کہ اس
کے بعد شتر کن بچھو کو کھا جاتا۔ اور یہ منظر دردناک تھا۔

میں نے ڈرائیور گگھر کو تاکیداً سمجھایا۔ کہ چلتے وقت وہ مجھے ضرور ایک بار بیدار کر دے۔

آخری رباط مہمند بھی چھوڑ دی

۲۳ مئی ۱۹۲۹ء (۲ برج جوزہ ۱۳۰۸ھ) روز جمعرات دو بجے نصف شب ڈرائیور گگھر نے مجھے

جگایا۔ اٹھو۔ وہ جا رہے ہیں۔ میرے ملازم نے مجھے ہینڈ بیگ لا کر دیا۔ اسے لیکر میں لاری میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑیاں ترتیب میں لگ چکی تھیں۔ وزیر دربار آیا اور سواروں کو چیک کرنے میں لگ گیا۔ مجھے گاڑی چھوڑنے کو کہا۔ اس کی تعمیل میں نے فوراً کر دی۔ بولا ابھی گاڑی قلات سے آ رہی ہے۔ اس میں سوار ہو جانا۔ اب جانے والے سب بیٹھ گئے۔ اور گاڑیاں چل دیں۔ جو پیچھے رہ گئے ان سب کو حکم ہوا کہ اندر رباط میں چلے جائیں۔ اس کی تعمیل حوالدار کی زیر نگرانی عمل میں آئی۔ رباط کے در پر پہرہ تھا۔ اور ہم رباط کے اندر۔ میں اب قدرے بے فکر تھا۔ میرے ہمراہ میرا ملازم تھا۔ اور شہر قندھار کوئی زیادہ دور نہ تھا۔ صرف آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ ہمارے پاس کوئی بوجھل سامان اٹھانے کو نہ تھا۔ آسانی سے پیادہ بھی یہ سفر طے ہو سکتا تھا۔ میرے بیگ سے نصف روپیہ چرا لیا گیا تھا۔ کہہ نہیں سکتا میرا ملازم چور تھا۔ یا کوئی اور۔ وقت کچھ ایسا ویسا ہی تھا۔ کچھ نفسا نفسی کا۔

رباط کے اندر دروازہ کے قریب آہنی چپر کٹ دیکھی۔ اس پر میں بیٹھ گیا۔ میرا ملازم عبدل میرے ساتھ تھا۔ اور وقت کا جو مشکلات کو حل کرتا ہے۔ سہارا لینے لگا۔ ایک کابلی نوجوان کو دھائیں مار مار کر روتے پایا۔ بولا اسے اکیلا پردیس میں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ سردار خلیل اللہ جان کا دوست تھا۔ اور اس کی رفاقت میں کابل چھوڑ آیا تھا۔ اور اب بے یار و مددگار پردیس میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے اسے بہت تسلی اور تشفی دی۔ میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ کہ اعلیٰ حضرت شہر قندھار سے باہر ہی اپنے خاندان کے افراد کو بل جائے گا۔ اور اپنے خاص رفقا سمیت ایران کی جانب نکل جائیگا۔ یہ گمان اس وقت نہ تھا۔ کہ وہ چمن کی طرف رُخ کرے گا حقیقت یہ تھی۔ کہ صوبہ ہرات امیر حبیب اللہ کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ اور اب صرف چمن ہی راہ گریز باقی رہ گیا تھا۔ اور انگریز کی گرفت سے بچنے کا اس نے انتظام کر لیا تھا۔ میں نے ایک بار کوشش کی۔ کہ رباط سے باہر جاؤں۔ لیکن پہرہ دار مانع ہوا۔ چار بجے کے قریب ایک لاری کے آنے کا شور ہوا۔ باہر ٹرک پر گیا تو معلوم ہوا۔ کہ سردار علی احمد جان قلات کی جانب سے

واپس آرہا تھا۔ خود ایک چھوٹی کار میں سوار تھا۔ اور اُس کے پیچھے ایک لاری تھی۔ جس میں کچھ سامان رکھا تھا۔
اور اس میں اُس کا بیٹا غلام محمد جان بیٹھا تھا۔ غلام محمد جان محاصرہ غزنی میں وہاں عسکر میں شامل تھا۔ اور مجھے
پہچانتا تھا۔ میں آگے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک بار سردار عنایت اللہ سلطان کی مجلس میں بھی مجھے اس کو دیکھنے کا موقع
ملا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ اور خوب بے تکلف مجلس تھی۔ حاضرین سب نوجوان سردار تھے۔ اور کالج کے شوخ
طلبائے والے موڈ میں تھے۔ سردار عنایت اللہ خان خود خیمہ میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اور باقی سب زمین پر
یہ اس وقت کا ذکر ہے۔ جب سردار صاحب اپنی بیماری کے دورہ سے صحت یاب ہو رہا تھا۔
اب کار چل پڑی۔ لیکن لاری کو لوگ روک رہے تھے۔ ہر ایک میری طرح اس میں بن بلائے گھسر
رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ڈرائیور نے لاری کو چلایا۔ اور ہم بہت جلدی علی الصبح نماز فجر کے وقت قندھار
کے شہر میں صحیح وسلامت پہنچ چکے تھے۔ شہر میں نماز فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اتر کر سردار صاحب کا
شکریہ ادا کیا۔ اور رخصت لے کر اپنے گھر کی طرف پیدل چل پڑا۔ میرا ملازم عبدل اب بھی میرے ساتھ تھا۔
سردار صاحب اپنے ٹھکانہ کی طرف چل دیا۔ اس کا ٹھکانہ حلقہ ارگ میں کوئی کمرہ ہوگا۔ یا وہ اپنے کسی
رشتہ دار کے ہاں چلا گیا ہوگا۔ اس کا آبائی وطن یہ قندھار ہی تو تھا۔ اب بھی اُس کے قریبی رشتہ دار
یہاں پر موجود تھے۔ سردار صاحب کا والد بزرگوار اپنی زندگی میں لوئی نائب کہلاتا تھا۔ لوئی سے
مراد بڑا ہے۔ اور اُن کے قدیمی مکان میں اِن دنوں ایک ہندی سوداگر قیام رکھتا تھا۔ اور اس کے پاس
یہ مکان گروی تھا۔ قندھار میں رواج تھا۔ کہ کرایہ پر لینے کے بجائے مکان اکثر گروی رکھ لیا جاتا تھا۔
چنانچہ جب میں ہرات سے تبدیل ہو کر قندھار پہنچا۔ تو میرے ایک قندھاری دوست نے ایک مکان مجھے
بھی تین ہزار روپیہ میں گروی لے دیا تھا۔ یہ روپیہ میرے ہندوستان واپس چلے آنے کے بعد
میرے ایک ہندی سوداگر دوست نے بڑی مشکل سے وصول کر کے مجھے بھیجا تھا۔ میرے جالندھر میں صرف
دس فیصدی اصل رقم کا آیا تھا۔ مجھے یہ سودا بہت مہنگا پڑا تھا۔ اس مکان کے فرش کے لئے جو

گلیمے (اونی دریاں) میں نے بازار سے خریدی تھیں۔ وہ کسی زمانہ میں کوئی نائب کے مکان کے کسی کمرہ کی زینت بن چکی تھیں۔ یہ ترکمانی ساخت کی تھیں۔ اور میرے ساتھ ہندوستان میں بھی آگئیں۔ اور اس کے بعد جہاں کہیں میں گیا۔ میرے ساتھ رہیں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ زندگی بھر میرا ساتھ دیں گی۔

یہاں آکر معلوم ہوا۔ کہ اعلےٰ حضرت شہر قندھار میں داخل نہ ہوا تھا۔ بلکہ سب فراری شہر سے باہر ہی اکٹھے ہو کر چمن کی انگریزی ہندی سرحد کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ یہ بھی یہیں آکر سُنا۔ کہ ولایت ہرات قبضہ سے نکل چکی تھی۔ اس کا علم بھی اعلےٰ حضرت کو ضرور ہو گا۔ اور یہ خبر کچھ کم حوصلہ شکن نہ ہو گی۔ سب سے بڑی بات یہ بھی تھی۔ کہ اعلےٰ حضرت کو ملک اطالیہ کی حکومت نے شہریت بخش دی تھی۔ اور اب وہ وہاں بلا روک ٹوک بین الاقوامی قانون کے زور پر جا سکتا تھا۔ اس طرح وہ انگریز کی گرفت سے بچ نکلا تھا۔ دوسری صورت میں امان اللہ خان ہندوستان کے کسی کونہ میں ایک نظر بند کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا۔ اس کے ملک کے کئی شاہی افراد نے ایسی زندگی گزار دی تھی۔ اور کچھ گزار رہے تھے۔

اعلےٰ حضرت نے راہِ فرار اختیار کرنے میں دور اندیشی سے کام لیا۔ ورنہ اس کا وہی حشر ہوتا۔ جو بعد میں سردار علی احمد جان کا ہوا۔ ہرات کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ اور اگر چمن کا راستہ بھی دشمن روک لیتا۔ تو پھر راہ گریز نہ تھی۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہے۔ قلات سے دشمن سیدھا قندھار میں داخل ہوئے بغیر چمن میں پہنچ سکتا تھا۔ اعلےٰ حضرت نے اپنے وطن عزیز کو اپنی اور اپنے بچوں کی سلامتی کی خاطر وقت پر خیرباد کہنے میں تاخیر نہ برتی۔ اور سب کو بے آبرو اور ذلیل ہونے سے بچا لیا۔

قندھار کا نیا شاہ

۲۳ مئی کا دن تھا۔ شہر قندھار اُداسی اور خاموشی سے دوچار تھا۔ ہر طرف خوف و بیم کا راج رنگ تھا۔ گو ہڑ بونگ کوئی نہ تھا۔ پھر بھی اُس کا امکان برابر موجود تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ امان اللہ خان اب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا۔ اور امیر حبیب اللہ اُن کے سروں پر سوار ہونے والا تھا۔ دشمن

کیا کچھ نہ کرے گا۔ عوام پائمال ہوں گے۔ بڑے پھانسی لگیں گے۔ اور کئی توپ کے منہ سے اڑائے جائیں گے۔ بہتیرے مال اور جائیداد سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اُن کے تصور میں اب اندھیرا اور غلزئی ان کے شہر کو چور کرنے اور لوٹ کھسوٹ سمیٹنے کی خاطر کابلی سپاہیوں کے شانہ بشانہ چلے آرہے تھے شہر میں گلی کوچے در بند ہونے لگے۔ ہر گھر ایک مورچہ دار قلعہ بن رہا تھا۔ گولی بارود خوب بک رہا تھا۔ دوکاندار قیمتی مال دوکانوں سے نکال کر گھروں میں لے جا رہے تھے۔ اور گھروں والے مال و زر پوشیدہ تہ خانوں میں اور کھوکھلی دیواروں میں چھپا رہے تھے۔ ہم کچھ ہندی لوگ ایک مکان میں جمع ہو گئے تھے۔ اور اس مکان کے ہندی مالک نے مجھے اس مکان کی پوشیدہ زیر زمینی دکھائی۔ اور اس میں وہ قیمتی سامان دفن کر چکا تھا۔ اب اس نے دو ملازم قندھاری اور رکھ لئے تھے۔ اور ان کو بندوق سے مسلح کر دیا تھا۔ بڑے بیرونی در کے قریب کچھ بوریاں مٹی سے بھر کر رکھ دی تھیں۔ جو بوقتِ ضرورت کیواڑ کے پیچھے رکھی جا سکتی تھیں۔ چھت پر بھی بوریوں کو مورچوں کی شکل میں رکھوا دیا گیا تھا۔

دن کے نو بجے میں نے دیکھا کہ وزیر حربیہ عبدالعزیز خان اپنی بڑی بڑی مونچھیں سنوارتا۔ اور سر نیچا ڈالے چند ایک رؤسا شہر کے ساتھ بادل نخواستہ بازار شاہ میں پیادہ گزر رہا تھا۔ اُس کے ہمراہ ایک دو پولیس کے سپاہی تھے جو لوگوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کرتے اور بتاتے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اپنی دوکانیں کھولیں اور بے دھڑک کاروبار میں لگ جائیں۔ کسی قسم کا شور و شر نہ تھا۔ میں خود بازار سے ہوتا ہوا سرکاری دفتر میں گیا۔ یہاں نوجوان عبدالوہاب خان پوپلزئی مستوفی (فنانشل کمشنر) ولایت قندھار کو کھڑا دیکھا۔ دو سرکاری ملازم اور بھی اس کے ساتھ شریک کھڑے دیکھے۔ ان سے معلوم ہوا آج دن کے بارہ بجے شہر کے اکابر اکٹھے ہوں گے اور ایک رئیس کا انتخاب ہوگا۔ جو سرِدست شہر کا عارضی طور پر انتظام بحال رکھے گا۔ اور امن میں خلل نہ آنے دے گا۔ پھر آئندہ کیا ہوگا۔ اس کا فیصلہ آنے والے واقعات کریں گے۔

مجلس ہوئی۔ عبدالعزیز خان وزیر حربیہ نے ریاست کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ وہ اس بارِ عظیم کے اٹھانے کا اہل نہیں رہا۔ اور ساتھ ہی تجویز کی۔ کہ یہ خدمت سردار علی احمد جان کو پیش کی جائے۔ وہ اس کا اہل بھی ہے۔ چنانچہ رخصت ہوتے وقت یہ ذمہ دار کام اعلے حضرت بھی اس ہی کے سپرد کر گیا تھا۔ سردار علی احمد جان نے اس بار کو بخوشی اپنے کندھوں پر لے لیا۔ ایسے جیسے کہ وہ اس کا متوقع اور منتظر تھا۔ اور لگے ہاتھ اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کر دیا۔ اور عبدالعزیز خان کو اپنا وزیر اعظم چنا۔

مجلس ختم ہونے پر سردار علی احمد جان گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور اس نے سارے شہر میں چکر لگایا۔ لوگوں کو تسلی دی۔ کہا علی احمد وطن کا خادم ہے۔ وہ بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ یہ شہر اس کا اپنا وطن ہے۔ وہ اس کی آخیر دم تک حفاظت کرے گا۔ لوگوں کو سمجھایا۔ اپنا کاروبار حسبِ سابق بڑے اطمینان سے کرتے جائیں۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی بدامنی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہو لے پائے گی۔

لوگ حیران تھے۔ کہ سردار علی احمد جان اس ڈوبتی ناؤ کو کیسے پار لے جائے گا۔ اسے علم ہوگا۔ کہ خزانہ خالی پڑا ہے۔ میگزین میں کچھ نہیں رکھا۔ دشمن سر پر کھڑا ہے۔ کیا وہ سمت مشرقی میں اپنا زور نہیں لگا آیا۔ پھر وہ اپنی جان پر ناحق کھیل کھیل رہا ہے۔ بعض کہتے اس کا اپنا ذاتی روپیہ ہندوستان کے بنکوں میں جمع پڑا ہے۔ اسے کیا پرواہ ہے۔ شاید کسی بیرونی طاقت کا ہاتھ اس کی پشت پر ہو۔ اکثر کا خیال تھا۔ اور یہ ٹھیک ثابت ہوا۔ کہ اب قندھار میدان میں نہیں آئے گا۔ اور مزید خطرہ مول نہ لے گا۔ در حقیقت یہ سب قیاس آرائیاں تھیں۔ حقیقت کا ان میں شائبہ بھی نہ تھا۔ جیسا کہ بعد میں آنیوالے واقعات نے ثابت کر دیا۔ معلوم دیتا۔ کہ سردار صاحب ایک نڈر مہمانہ طبیعت کا اور ایک بے چین متحرک شخصیت کا مالک تھا۔ اپنی جان کو انجام سے بے خبر جوکھوں میں ڈال دینے والا فرد تھا۔ اپنی کمزوری سے بے نیاز ہاتھی سے ٹکر لینے والا انسان تھا۔ وہ بڑ ہانکنے اور بننے کے خبط سے بھی خالی نہ تھا۔ اسے لوگوں کی اچھی اور بری تنقید کی پرواہ بھی نہ تھی۔ وہ اپنی دھن میں اپنا مالک تھا۔ اور ضرورت سے زیادہ صاحب خود اعتماد۔

نہ گئی۔ یہاں ٹھہرے رہنے کا اسے خطرہ تھا۔ آج وہ یہ سب کچھ اپنے خیر خواہ اور دور اندیش خویش کے منشا کے خلاف کر رہا تھا۔

جب ایک مجلس میں حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ حضور نے غور نہیں فرمایا۔ خزانہ اور توپ خانہ کی حالت کیا ہے۔ تو جواب دیا ان چیزوں کی کمی نہیں۔ توپیں لاؤ۔ جوانوں کی کمی ہے۔ ایک دو دن تک چالیس ہزار گیارہ ڈھکی رائفلیں پہنچ رہی ہیں۔ ان کے چلانے کے لیے جوان درکار ہیں۔ یہ خیالات بلند تھا لیکن یہ ایک محض جھانسا اور خالص ڈھونس۔

نیا بادشاہ اور بیعت

نیا عہدہ سنبھالتے ہی سردار علی احمد جان نے نئے سرے سے کچھ عہدہ دار مقرر کئے۔ اور انتظام اور اہتمام کیلئے دفتر کھولے۔ مرزا صاحبان پھر ایک بار کام کے لئے میزوں پر جھک گئے۔ جب میں سرائے کی جنوبی طرف گیا۔ سردار صاحب کو دیکھا۔ ایک بڑی کرسی پر بیٹھا بیعت لے رہا تھا۔ گرد سے باہر تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ خود سر سے ننگا معمولی خاکی کپڑوں میں ملبوس بڑی متانت اور سرگرمی سے کام میں مصروف تھا۔ دیکھنے والا باور نہ کرتا۔ کہ سردار صاحب کو ناکامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوگا۔ میں نے سلام عرض کیا۔ بڑی شفقت سے پیش آیا۔ مجھ سے دریافت کیا۔ کیا واپس ہند جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور ساتھ ہی کہا اگر کچھ وقت اور ٹھہر جاؤ۔ تو ڈر کی کوئی بات بھی نہیں۔ چنانچہ میں ٹھہر گیا۔ اور ہر روز دربار میں جانے لگا۔ اور خیریت دریافت کرتا۔ عوام الناس سمجھنے لگے کہ جو کچھ سردار صاحب کہتا تھا۔ ان سب میں کچھ راز تھا۔ جس کو وہ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ بہر حال شہر محفوظ تھا۔ اور لوگ بظاہر مطمئن اور خاموش۔ اب ہمارے سپاہی لوگ قلات سے واپس پہنچ رہے تھے۔ شہر کو پرامن رکھنے اور سپاہیوں کو دست برد سے بچانے کیلئے لاریاں غلہ سے بھر بھر کر قلات کی جانب روانہ کیں۔ اور حکم دیا۔ کہ سپاہ کا ہر فرد جو قندھار میں داخل ہو۔ بھوکا اور پیاسا آئے پیٹ بھر کر اسے کھلاؤ۔ قلات سے لوگ بھوکے پیاسے

تھکے ہارے اور دل شکستہ اور رنجیدہ خاطر آرہے تھے۔ ان کا پچکار نا ضروری تھا۔ ادھر شہر کے دروازوں پر بھی اپنے آدمی کھڑے کر دیئے۔ جو چار پانچ سے زیادہ سپاہی ایک وقت میں شہر میں داخل نہ ہونے دیتے۔ بلکہ افواہ گرم تھی کہ آنے والے سپاہی کو فی کس پانچ قران نقدی بھی دیئے جاتے۔ اگر یہ صحیح تھا۔ تو انسانی ہمدردی کے علاوہ یہ ایک دور اندیشانہ فعل تھا۔ ناراض اور بھوکے عسکریوں کو خوش کرنے کا ایک اچھا آلہ اور حربہ ورنہ یہ لوگ شہر میں اودھم مچا دیتے۔ اور آناً فاناً امن برباد کر دینے پر قادر تھے۔ حکومت تو نہ ہونے کے برابر تھی ہی۔ اب یہی لوگ سردار صاحب کی ہمدردی دور اندیشی اور عاقبت شناسی کے گن گاتے تھے۔

۲۴ رمئی کا دن

۲۴ رمئی عبدالعزیز خان جو کل وزیر اعظم بنا تھا۔ سنا گیا چمن کی طرف بھاگ گیا تھا شہر میں ہر طرح امن وامان تھا۔ عسکری لوگ تھوڑی تھوڑی تعداد میں شہر میں داخل ہوتے رہے۔ آج شفا خانہ کے ملازم جو قلات میں رہ گئے تھے۔ واپس قندھار زندہ وسلامت پہنچ گئے۔ میرا ذاتی سامان نہ لائے۔ یا خود ہضم کر گئے۔ عذر یہ پیش کیا کہ بارگیری کے لئے جانور دستیاب نہ ہوئے تھے۔ حالانکہ اپنا سامان سب ٹھیک ٹھاک لے آئے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ اعلےٰ حضرت کا نکلنا تھا۔ کہ لشکر بے قابو ہو گیا۔ دشمن قلات کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ جو ہمارے سپاہی مورچہ میں بیٹھے دشمن کا راستہ روک رہے تھے۔ وہ بھی پیچھے ہٹ آئے تھے۔ جب یہ ملازمین باغ سے نکل رہے تھے تو غنیم قلعہ قلات پر گولے پھینک رہا تھا۔ ادھر لوگ آپس میں بارگیری کے جانور حاصل کرنے کیلئے آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ کوئی آمر نہ تھا قلات افراتفری میں خالی ہو رہا تھا۔ اب وہ لگاتار شب وروز منزلیں مارتے بھوکے پیاسے اپنے شہر قندھار میں تھکے ماندے پہنچے تھے۔

خفیہ جلسے

۲۵ ر ۲۶ رمئی بشہر پرامن رہا۔ معلوم ہوا۔ اکابرین شہر خفیہ مراسلات غنیم کو بھیج رہے تھے غنیم کو اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلایا گیا تھا۔ اور یہ کہ انہا کے آنے پر مزاحمت نہ ہو گی۔

بلکہ شہر کا دروازہ کھول دیا جائیگا۔ اس کو یہ بھی بتایا گیا تھا۔ کہ سب لوگ امیر حبیب اللہ کی بیعت پر متفق ہیں۔ کسی کو کوئی عذر نہیں۔

سوموار ۲۷ مئی اتفاق سے آج شام ارگ کے چمن سے گزرا تو دیکھا کہ سٹیج پر کھڑا سردار علی احمد جان کچھ شاید تقریر کر چکا تھا۔ سامعین کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہ تھی۔ وہ بھی عوام سے متعلق تھے۔ کوئی اکابر اور رئیس نہ تھا۔ میرے سامنے صرف ایک نو مسلم نے شاید دو ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ اور میرے کھڑے کھڑے جلسہ ختم اور برخاست ہو گیا۔ اور سردار صاحب نے جو قندھار میں بادشاہ بھی تھا خود اپنے ہاتھ سے چندہ کی تھیلی میز پر سے اٹھالی اور چل دیا۔ سبحان اللہ کس درجہ استقلال تھا۔ اور ارادہ میں پختگی کس قدر۔ معلوم ہوا کہ اجتماع فراہمی زر کے لئے تھا۔ اور اس کا مصرف غنیم کا مقابلہ تھا۔ اس ادنی اجتماع سے موجودہ حکومت کا وقار اور لوگوں کی بے رخی واضح تھی۔ حقیقت حال کا بھانڈا سر عام پھوٹ رہا تھا۔ لیکن سردار صاحب کا اعتماد اور ایمان خدا جانے کیوں متزلزل نہ ہوا۔ اور اس نے ہر تی بازی سے کیوں آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ آج شام کا اجتماع اور رد عمل آنکھیں کھولنے کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔ تقدیر کھیل رہی تھی۔ اور نشہ کا جادو سر پر سوار تھا۔

۲۸ مئی۔ غنیم رباط تہمند میں پہنچ گیا تھا۔ شہر سے صرف آٹھ میل دور۔ شہر بند پڑا تھا۔ آج کچھ لوگ ایک مسجد میں جمع ہوئے۔ امیر حبیب اللہ کے حق میں بیعت نامہ لکھا۔ سردار علی احمد جان خبر پاتے ہی موقع پر پہنچ گیا۔ پستول کے چند ہوائی فائر ہوئے۔ اور مجمع منتشر ہو گیا۔ بیعت نامہ پھاڑ دیا گیا۔ دشمن کے مقابلہ میں کچھ قندھاری لوگ باہر گئے۔ سنا گیا۔ کہ عبد العزیز خان وزیر حربیہ حال وزیر اعظم قندھار واپس آگیا تھا۔

شہر قندھار قلعہ بند ہو گیا

۳۰ مئی (۱۰ برج جوزہ) آج دربار میں گیا۔ دیکھا کر سردار صاحب سلام خانہ میں بیٹھا خود اپنے روبرو اسلحہ تقسیم کر رہا تھا۔ ایک سپاہی ایک شخص کو پکڑ لایا تھا۔ اس کو خوب پٹوایا۔ ڈنڈا نہ تھا۔ سردار صاحب نے اپنی چھڑی دے کر اسے پٹوا دیا۔ دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ سردار صاحب اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دیر تک واپس

نہ آیا۔ اب بارود ختم ہو گئے۔ میں سلام خانہ سے نکل کر باہر باغیچہ میں آ گیا۔ اور وہاں سے دروازہ ارگ میں پہنچ گیا۔ عام شہری لوگ لڑائی دیکھنے کے شوق میں جوق در جوق شہر سے باہر جا رہے تھے۔ دیکھا کہ شہر کی طرف سے بازار شاہ میں ایک موٹر کار چمن ارگ کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ آ کر دروازہ ارگ میں رک گئی۔

کار میں سے عبدالعزیز خان اور سردار علی احمد جان باہر نکلے۔ عبدالعزیز خان وہیں ارگ سے واپس شہر چلا گیا۔ اور از بعد میں نے ان صاحب کو پھر کبھی نہ دیکھا۔ اس کے بعد پھر ایک بار صرف اس کا نام ہی سنا وہ بھی تب جبکہ میں نے افغانستان کو خیر باد کہا۔ اور چمن میں داخل ہوا۔ اور وہ ۱۹ جون ۱۹۲۹ء کا دن تھا۔ ایک ہندوستانی سرحدی پہریدار جو ایک دو داڑھی میں بہت بھلا معلوم دیتا تھا۔ بولا ڈاکٹر صاحب چہ عجب آپ کے وزراء تو اونٹوں پر راہ اور بے راہ سفر طے کر کے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ اور آپ آسودہ لاری میں سفر کر کے آئے ہیں۔ غالباً یہ اشارہ عبدالعزیز خان کی طرف تھا۔ تو کیا آپ کو ناگوار گزرا ہے۔ میں بولا۔ کہا ہرگز نہیں۔

میں نے دیکھا کہ سفید مگر مضبوط اور سرخ و سپید ۶۰ سالہ سردار صاحب نے بش شرٹ کی آستینیں جوانوں کی طرح اوپر چڑھالیں اور خود تن تنہا اپنے ہاتھوں سے فصیل ارگ پر توپ چڑھوانے میں مصروف ہو گیا۔ واللہ اللہ کیا دم خم تھا۔ اور کس قدر بے باک اور نڈر۔ اور ساتھ ہی حکم دیا۔ کہ ارگ کا دروازہ بالکل بند کر دو۔ لیکن دروازہ بند کرنے کیلئے مجھے کوئی دوسرا فرد وہاں کھڑا نظر نہ آیا۔ یہ کام شاید سردار صاحب کے ڈرائیور کا تھا۔ اب شہر قلعہ بند ہو گیا تھا۔ اور دروازے مقفل ہو چکے تھے۔ بلا اجازت کوئی اندر باہر آ جا نہ سکتا تھا۔ شہر کی فصیل پر اب سپاہی مورچے سنبھال رہے تھے۔ سنا گیا کہ شہر سے باہر قندھاری لوگوں نے بڑی ہمت سے ایک حملہ کیا۔ اور اگر کچھ دیر ثابت قدمی دکھاتے۔ تو شاید کوئی اچھی صورت بن جاتی۔ یہ بھی سنا گیا کہ خیرو جان حاکم تبابت اس حملہ میں نمایاں حصہ لے رہا تھا۔ کچھ شہری لوگ جو تماشہ دیکھنے وہاں باہر جمع ہو چکے تھے۔ سنسناتی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ سے گھبرا کر واپس شہر کو بھاگے۔

اور اس کا اثر بد قندھاری لڑاکوں پر بھی پڑا۔ آخر اللہ کرنے سمجھا۔ کہ یہ شکست کی علامت تھی۔ لہذا وہ بھی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور میدان غنیم کے ہاتھ رہا۔

ڈیڑھ بجے غنیم نے شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ وقفہ پر توپ چلنے کی آواز آتی۔ اندھا دھند گولہ باری نہ تھی۔ جواب میں شہر سے بھی ایک توپ کام کرتی سنائی دیتی۔ کبھی کبھار فصیل پر سے بندوق چلنے کی بھی آواز آتی۔ دشمن کی گولہ باری کا رُخ ارگ کی طرف تھا۔ کچھ وقفہ بعد ہماری توپ خاموش پڑ گئی۔ ایک ملازم آیا۔ اس نے بتایا کہ توپ کے پاس تنہا کھڑا سردار صاحب توپچی کی مدد اور حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ توپ بے کار ہو گئی۔ گویا سردار صاحب تنہا ایک طرف غنیم کے مقابلہ میں ڈٹا کھڑا تھا۔ شام ہو گئی۔ نماز مغرب کے وقت گولہ باری بند ہو گئی۔ رات تاریک تھی۔ فصیل پر سے کبھی کبھی اِکا دُکا گولی چل جاتی۔ مکان شہر میں در بند تھے۔ اور گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ لوگ چوکنے بیدار مگر سہمے ہوئے۔

آج رات فصیل سے باہر امیر حبیب اللہ کے فوجی افسران خلیفہ وہ خوجہ محمد عمر جان کے مہمان تھے۔ سُنا گیا۔ دعوت پر تکلف تھی۔ رات امن میں گزر گئی۔

۳۱ مئی (۱۱ برج جوزہ) نو بجے صبح ارگ پر جھنڈا بلند ہوا۔ آج صبح ہی سے احاطہ خرقہ مبارک میں اہالی قندھار جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں ایک جلسہ عام ہوا۔ اس میں فیصلہ ہوا۔ کہ شہر کے در کھول دیئے جائیں۔ اور قلعہ بندی ختم کی جائے۔ امیر حبیب اللہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا جائے۔ وہ مدافعت کے قابل نہیں رہے تھے۔ اگر غنیم اپنی طاقت کے بل بوتے پر شہر میں داخل ہوا۔ تو نقصان عظیم ہو گا۔ اب بھی وقت تھا۔ کہ شہر کو تباہی اور بربادی سے بچا لیا جائے۔ اُدھر سردار صاحب ارگ کے تہ خانہ میں مجلس کر رہا تھا۔ فوراً سید و خان کو بھیجا۔ کہ خرقہ مبارک کا جلسہ روک دے۔ سید و خان کامیاب نہ ہوا۔ اگر اور مزاحم ہوتا۔ تو وہاں سے اس کا زندہ

نکلنا مشکل ہو جاتا۔ بیعت نامہ لکھا گیا۔ اور امیر حبیب اللہ کے سپہ سالار پُر دل خان کو فصیل سے باہر پہنچا دیا گیا۔ ایسا ہی ایک بیعت نامہ در پردہ بعض اکابرین شہر چند یوم پہلے سپہ سالار کو بھیج چکے تھے جسکی بنا پر سپہ سالار نے قلات میں ایک مجلس بلائی تھی۔ اور انڈھر اور غلزئی قبائل کو ان کے خلاف نشانہ رخصت کر دیا تھا۔ اور ان کی ناراضگی کی پروا نہ کی تھی۔ اور سپہ سالار اب صرف اپنے کابلی سپاہی ہی قندھار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس طرح قندھار کو لوٹ مار اور ہلاکت سے بچا دیا تھا۔ جب پُر دل خان قندھار پہنچا۔ تو قندھاریوں کو اپنے مقابلہ میں آتے دیکھ کر انتہائی طور پر رنجیدہ اور پریشان ہوا تھا۔ مجھے امیر حبیب اللہ کی سپاہ کے ایک فوجی افسر نے لوہ میں بتایا۔ کہ اگر قندھاری لوگ ذرا ہمت دکھاتے تو گرمی سے گھبرائے ہوئے کوہستانی سپاہی زیادہ دیر تک شہر کا محاصرہ قائم نہ رکھ سکتے تھے۔ وہ شدت کی دھوپ برداشت کرنے کے عادی نہ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ علاقہ قندھار میں بڑی شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ زمان تمالستان میں لوگ دوپہر کا وقت تہ خانوں میں گزارتے ہیں۔ کوئی اچھا گھر بغیر تہ خانہ نہیں۔ ۹ بجے دن کے بعد دھوپ میں چلنا پھرنا تکلیف دہ اور دشوار ہو جاتا ہے۔ اس علاقہ میں سفر گرمیوں میں رات کے وقت کیا جاتا ہے۔ سردی بھی کوئی کم نہیں پڑتی۔

گولہ باری نہ ہوئی۔ فصیل سے غنیم پر اکا دکا بندوق چل جاتی غنیم فصیل سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس نے شہر کو وقت دیا۔ کہ دو بجے دوپہر تک اگر شہر کا دروازہ نہ کھولا گیا۔ تو وہ اپنی پوری طاقت سے شہر پر گولہ باری کرے گا۔ اور اس نے اس مقصد کے لئے اپنی بڑی توپیں موزوں موقعوں پر نصب بھی کر دیں۔ اہالی شہر گزشتہ روز کی گولہ باری سے خائف ہو چکے تھے۔ بعض گولے جو ادھر ادھر نشانہ سے دور گرے تھے ان سے شہری مالی اور جانی نقصان ہوا تھا۔

کابلی دروازہ کھول دیا گیا

۳۱ مئی دن کے دس گیارہ بجے ہوں گے ۔ کابلی دروازہ کی طرف یکایک مشین گنیں اور بندوقیں چلنے لگیں ۔ قرب کی وجہ سے ایسا معلوم دیتا تھا ۔ کہ ہمارے محلہ میں ہی گولی چل رہی تھی ۔ اور نشان ہمارا اپنا مکان تھا ۔ خوف سے مغلوب ہو کر ہم چھت کے نیچے چلے گئے ۔ اس سے پہلے ہم کوشش میں تھے ۔ کہ چھت پر چڑھ کر لڑائی اپنی آنکھوں سے دیکھیں ۔ بات یہ تھی ۔ کہ لوگوں نے زبردستی کابلی دروازہ کھول دیا تھا ۔ اور ساتھ ہی امیر حبیب اللہ زندہ باد کا نعرہ بلند کیا تھا ۔ دروازہ کھلتے ہی غنیم کے منتظر سپاہی اندر داخل ہو گئے تھے ۔ اور عین دروازہ میں فوراً اپنا مورچہ قائم کر بیٹھے تھے ۔ ادھر سردار صاحب لوگوں کے ارادہ سے باخبر ہو کر شہر کے چوراہا میں پہنچ گیا تھا ۔ اس کے ہمراہ سید خان اور فقط دو تین اور ساتھی تھے ۔ جب دشمن نے ان کو سید ھا سامنے سے آتے دیکھا ۔ تو فوراً مشین گن اور بندوقوں سے ان پر پے در پے فائر کئے ۔ سید خان نے سینہ میں گولی کھائی ۔ اور بعد میں اس کو شفاخانہ ملکی میں زیر علاج دیکھا ۔ لیکن جانبر نہ ہو سکا ۔ کہنے لگا (اور مجھے اس کے مایوسی میں کہے ہوئے الفاظ ہمیشہ یاد رہیں گے ۔ نڈر شیر کا بچہ اب ایک ناتوان بچہ تھا ۔ اور سہارا کا متلاشی اور خواستگار ۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے) کیا میں بچ بھی جاؤں گا ؟ ڈاکٹر صاحب میرا علاج خود سے کریں ۔ آپ سے کیا پوشیدہ ہے ۔ میں اپنے ملک اور قوم کے لئے جان دے رہا ہوں ۔ میں تا دم آخر اپنی زبان پر قائم رہا ۔ مجھ سے بے وفائی نہ ہو سکتی تھی ۔ یہ سچ ہے وہ زبان کا پکا نکلا ۔ اور طبعاً وہ آسانی سے پہلو نہیں بدل سکتا تھا ۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی تھی ۔ اور نہ ہی کچھ آغا اشرف نے کر دکھایا تھا ۔

سردار صاحب کا سفید گھوڑا گولی کھا کر گر گیا ۔ اور وہ خود اکیلا پاپیادہ گلیوں میں

سے ہوتا اندر بچتا بچاتا ارگ پہنچا۔ لیکن وہاں اب کون تھا۔ جو اس کا ساتھ دیتا۔ لاچار شہر میں کہیں چھپ بیٹھا۔ مدافعت ختم ہوئی۔ اور شہر حبیب اللہ کے تصرف میں جا چکا تھا۔ چنانچہ اب غنیم کا ایک مضبوط دستہ سنسان بازاروں سے گزرتا ہوا بغیر کسی روک ٹوک ایک بجے دوپہر کے قریب ارگ میں جا اترا۔ نصف گھنٹہ بعد عبدالسلام آفندی آیا۔ اور اس نے آج کی کاروائی کا چشم دید حال سنایا۔ عبدالسلام آفندی کا دعویٰ تھا۔ کہ وہ ملک ترکیہ میں رہ آیا تھا۔ لیکن غالباً ایسا نہ تھا۔ اور آفندی اسے کیوں کہا جاتا۔ اس کا علم مجھے نہ تھا۔ زیادہ تلطف سے کروہ یہ بیان کیا کرتا۔ کہ وہ کچھ عرصہ پہلے بمبئی میں لوگوں کو الّو بنا چکا تھا۔ اس نے وہاں پیر کا عام کھیل رچایا تھا۔ اور کافی لوگ اپنے پیچھے لگا لئے تھے۔ وہ مزے لے کر بتاتا۔ کہ وہ دن کو اپنے آپ کو بھوکا رکھتا اور رات گئے چوری چوری پیٹ بھر لیتا۔ اور مریدوں پر ظاہر کرتا۔ کہ وہ بغیر کھائے پیئے زندہ تھا۔ دن کو ہُو ہا سے اُن کو مرعوب رکھتا۔ آخر حکومت ہند نے اُسے غیر پسندیدہ جان کر ملک بدر کر دیا تھا۔ عبدالسلام دراصل تنہ صارکا رہنے والا تھا۔ اور ابن الوقت اور دوسروں کے مصائب سے ہاتھ رنگنے والا۔ اب اس کا گزارہ صابون سازی کے معمولی سے کاروبار پر تھا۔ سیاسیات میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اخبارات بڑے غور سے پڑھتا۔ اِدھر اُدھر سے بغیر کچھ خرچ کئے حاصل کر لیتا تھا۔ ہندوستان سے آنے والی اخبارات کا بڑے انہماک سے مطالعہ کرتا۔ عمر کی پچاس پچپن بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اب بھی جسم کا مضبوط اور ڈیل ڈول اور قطع وضع میں کافی مرعوب کن تھا۔ اچھی خاصی شخصیت کا مالک تھا۔ خود غرض ڈراؤنی آنکھیں تھیں۔ زبان اردو خاصی بول لیتا تھا۔ رحمت اللہ ہمایوں ہندی مہاجر سے اس کی خاصی چھنتی تھی۔ رحمت اللہ بظاہر اس کی باتوں کی اور سیاسی خیالات کی قدر کرتا معلوم دیتا تھا۔ آفندی مجھ سے شاکی تھا۔

میں اس کی باتوں کو اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس کی بات چیت کو ڈھکوسلہ سمجھتا۔ اور ایسے ابن الوقتی اگرچہ عادتاً
وہ نمازی تھا۔ اس نے آج اس بات کو پوشیدہ نہ رکھا۔ کہ وہ خود دروازہ کابل کے کھولنے میں
برابر کا حصہ دار تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ وہ کیوں انقلاب سے فائدہ نہ اٹھائے۔
بلکہ اس کے اور رحمت اللہ ہمایوں کے درمیان کچھ راز و نیاز چل رہا تھا۔ اور مخفی وابستگی بھی
ہوتی نظر آتی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ رحمت اللہ ہمایوں کہاں تک اس میں سچا اور الیا نداد
تھا۔ یا یہ کہ مصلحتاً اس کا ہم نوا بن گیا تھا۔ رحمت اللہ ذہین اور معاملہ فہم ضرور تھا۔ اور
باریک بین بھی۔ اور ان صفات کو مدنظر رکھ کر غالباً آفندی ایسے اس سے شوہ بھی لیتا۔ کیونکہ کچھ تعارفی
خطوط اور ایسے ہی اور خط و کتابت کا ان دونوں میں چکر چل رہا تھا۔ شاید تعارفی خطوط کے ساتھ
آفندی اب امیر حبیب اللہ کو یا اور کسی اہم شخصیت کو کابل میں ملنے والا تھا۔ اور اپنی مخفی
خدمات کے صلہ کا متوقع تھا۔

آفندی نے ایک بار مجھے دھمکی بھی دی۔ کہ مجھے کسی وقت حکومتِ حال سے نقصان اٹھانا
ہوگا۔ اور میں ڈر بھی گیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم دیتا۔ کہ آفندی کا نئی حکومت میں کچھ اثر و رسوخ
بن رہا تھا۔ اور اس کا ملاقاتی پر ابتدائی تاثر بھی تو خاصا رہتا۔

عبدالسلام کو سیاسیات پر تبصرہ کرنے کا شوق تھا۔ اور وہ اس میں اپنے آپ کو مشاق
سمجھتا۔ وہ ہندوستان کے سیاسی کوائف پر جب کبھی گفتگو کرتا۔ اور اس میں گاندھی جی کا ذکر
آتا۔ تو وہ گاندھی جی کو گانڈھی جی کہتا۔ اور تلفظ اس نے ہمارے بار بار ٹھیک کرنے پر بھی نہ
بدلا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جاتا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے اور زیر لب مسکرا دیتے۔
اور سنجیدہ بنے اس کا کلام سنتے رہتے۔ اسے کبھی ہماری مسکراہٹ کا احساس نہ ہوتا۔

سپہ سالار پُر دِل خان سے ملاقات

۳۰ مئی بلا وجہ کچھ خطرہ مول لیتے ہوئے میں نے ہمت کی۔ اور اکیلا ڈھائی بجے لبد دوپہر کے قریب میں فاتح سپہ سالار کو ملنے چل پڑا۔ یہ شاید کسی چھٹی حس کا کارنامہ تھا۔

ورنہ بظاہر پہلے دن ہی اور اتنی شتاب یہ قصد دور اندیشی سے بعید معلوم دیتا تھا ارگ کا ڈاکخانہ والا دروازہ کھلا تھا۔ اور اس میں ایک کابلی سپاہی پہرہ پر کھڑا تھا۔ دروازہ سے باہر بہت سے من چلے قندھاری لڑکے اور بچے تماشبین بن کر کھڑے نو وار مہمانوں کو بڑے غور سے دیکھ اور جانچ تول رہے تھے۔ میرے کہنے پر کہ میں ڈاکٹر ملکی ہوں۔ سپاہی مزاحم نہ ہوا۔ شاید اسے ہدایت ہو گی۔ کہ ملنے کی خواہش رکھنے والے شرفا کو نہ روکے۔ اب دفتروں کے خالی کمرہ جات میں کابلی سپاہی مقیم تھے۔ وہاں اندر کوئی قندھاری نظر نہ پڑا۔ ایسا معلوم دیتا تھا۔ کہ شاید پہلا شخص جو یہاں ملنے آیا تھا۔ شاید وہ صرف بندہ ہی تھا۔ دفتر سے گزر کر جب میں بُرج کی طرف جانے لگا۔ تو دوسرے اور پہرہ دار نے مجھے روکا اجازت آنے پر ایک سپاہی میرے ہمراہ ہو لیا۔ سیڑھیوں پر سے ہوتا ہوا مجھے بُرج میں لے گیا۔ یہاں سپہ سالار پُر دل خان اور اس کا نائب سالار دونو اکیلے ننگے سر کرسیوں پر بیٹھے تھے ان کے نزدیک ایک دو سپاہی کھڑے تھے۔ اور ایک دو فرش پر بے تکلف بیٹھے تھے۔ اور اپنے سپہ سالار اور نائب سالار کی طرف متوجہ تھے۔

سپہ سالار سرخ و سپید کوئی ۳۷ سالہ جوان ہوگا۔ درمیانہ قد۔ درمیانہ جسم لمبی لمبی لب تراش سنہری شرعی مونچھیں تھیں۔ ڈاڑھی خشخاص طرز کی تھی۔ غالباً چہرہ پر چیچک کے داغ تھے۔ جو وقت گزرنے پر مدھم پڑ گئے تھے۔ اچھا خوش شکل بانکا جوان تھا۔ دھوپ اور سفر نے رنگ کچھ پکا دیا تھا جسم پر خاکی رنگ کابلی ساخت کا بند گلے کا

کوٹ تھا۔ نیچے خاکی کھڑا پاجامہ تھا۔ پاؤں میں کابلی ساخت کے موٹے تلے کا جوتا تھا۔ کارتوسوں سے لدی ہوئی چار پٹیاں اس کے جسم کے آر پار لگی تھیں دو اوپر نیچے کمر پہ اور دو کندھوں پر نشان ضرب بناتے ہوئے۔ گھٹنوں پر ایک ۳۰۳ رائفل تیار رکھی پڑی تھی۔ مجھے ہاتھ مصافحہ کے لئے دیا میں نے خیریت پوچھی۔ بولا شفاخانہ کا سامان تو کسی سپاہی نے نہیں چھیڑا۔ میرا رقعہ لے جانا۔ شفاخانہ کے سامان سے کوئی تعرض نہ رکھے گا۔ پھر کہا یہاں پر کافی گرمی ہے۔ سفر کی کوفت ہے دور ہو جائے گی۔ اس کے بعد اپنے نائب سالار سے تعارف کرایا۔ جو پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھا تھا۔ نائب سالار قوم کا افغان تھا۔ اور خود سپہ سالار شاید تاجیک تھا۔ نائب سالار عمر میں کوئی اٹھائیس سال ہو گا۔ رونچا لانبا جوان تھا۔ چھریرا جسم۔ لمبا چہرہ۔ نیلی آنکھیں پتلا بلند ناک۔ کھلا رنگ سرخی مائل۔ بولا۔ میری نبض دیکھو۔ میں اچھا نہیں ہوں۔ میں نے کہا۔ سفر کی کوفت اور تکان ہے۔ اور راستہ کی گرمی۔ کوئی فکر والی بات نہیں۔ بڑا خوش ہوا۔ میں نے اضافہ کیا۔ سرد اشیا کا استعمال ٹھیک رہے گا۔ خدا کے فضل سے ان اشیا کی یہاں کوئی کمی نہیں قندھار ان کے لئے معروف ہے۔ نائب سالار نے خندہ پیشانی سے کہا۔ ان کے لئے تو ترس ٹھکے ہیں۔ قندھار کی گرمی کیا ہے۔ دوزخ کی تپش ہے۔ الاماں! قندھار کی راہ جہنم کی راہ ہے۔ ہم نے کب ایسی گرمی دیکھی تھی۔ ہمارا کوہ دامن تو بہشت ہے۔ میں نے کہا۔ کابل میرا دیکھا ہوا ہے۔ اور میں نے کچھ وقت وہاں گزارا ہے۔ بہت اچھا ملک ہے۔ وہاں سب نعمتیں میسر ہیں۔

میں کوہ دامن کے لوگوں سے کچھ مانوس تھا۔ کابل میں میرا ملازم اور اس کی والدہ میری ملازمہ دونوں کوہ دامنی تھے۔ بڑے جاں نثار قسم کے ملازم تھے۔ تعمیل کار میں فرق نہ رکھتے تھے۔ حکم کے بندے تھے۔ بڑے خوددار غصیل اور لڑاکے۔ ان میں احساس کمتری

کا نشان بھی نہ تھا۔ طبیعت میں آزادی رچی ہوئی تھی۔ ملازمت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جوا میں زمین ہار چکا تھا۔ لہذا ملازمت کا سہارا لینے پر مجبور ہوا۔ بعد ازاں جبری فوجی بھرتی میں اسے خوست کی بغاوت میں جانا پڑا۔ اور وہیں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس نے بتایا۔ کہ خوست کے لوگ آدمی کیا ہیں۔ دیو ہیں۔

برج میں تمام کا تمام کمرہ ویسے کا ویسا سجا تھا۔ جالی پوش آہنی چپرکھٹیں ترتیب سے لگی پڑی تھیں۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ اعلےٰ ساخت کے کوچ اور کرسیاں نو واردوں کے لئے وقف ہو گئے تھے۔ اور غالباً ایسے کمرہ کا استعمال ان کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ چند ماہ پیشتر وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ ایک دن اُن کا نصیب اتنا بلند ہو گا۔

میں نے رخصت لی۔ اور واپسی پر اپنے شفاخانہ ملکی میں چلا گیا۔ تحویلدار نے مجھے بتایا۔ کہ سپاہی لوگ سامان اٹھانے لئے جا رہے تھے۔ ابھی وہاں کھڑا ہی تھا۔ کہ ایک کابلی سپاہی آیا۔ اور ایک بڑا مسی دیگچہ اٹھا لے گیا۔ دوسرا آیا۔ وہ ایک چارپائی پر سے بستر اٹھا لے گیا۔ کون بیوقوف انہیں منع کرتا۔ وہ پھر اجنبی تھے۔ اور مستحق بھی۔ بازار سنسان تھا۔ اور دوکانیں بند۔ نڈر تماشبین البتہ بازار میں گھوم پھر رہے تھے۔

سردار علی احمد جان پکڑ لیا گیا

یکم جون (۱۲ برج جوزہ) کابلی سپاہی چھوٹے چھوٹے دستوں میں آج سارا دن شہر میں داخل ہوتے رہے۔ چار اطالوی ساخت کی بھاری توپیں ہاتھی کھینچ کر لا رہے تھے۔ ہر سپاہی جوان اور جاندار تھا۔ اور اُس کا چہرہ تندرست سرخ۔ ان توپوں کو میں نے ارگ کے صحن میں دیکھا۔ پاس ہی ہاتھی بندھا تھا۔

۱۷ جون آج تیسرے روز ۱۱ بجے دن کے قریب سنا گیا۔ کہ سردار علی احمد جان پکڑ لیا گیا تھا۔ وہ شاید کسی دوست کے گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ سنا گیا۔ کہ سر اور پاؤں سے ننگا دو سپاہیوں میں گھرا ہوا اُسے سپہ سالار کے روبرو پیش کیا گیا۔ بہت بے آبرو کیا گیا۔ منہ پر طمانچے اور پیٹھ پر بندوق کے کندے لگائے۔ پھر اسے کابل روانہ کر دیا گیا۔ سنا گیا سردار صاحب سے سوال کیا جاتا۔ جب وہ جواب دینے لگتا۔ تو اس کو پیٹا جاتا۔ شاید اس کے جواب احترام اور ادب سے خالی سمجھے جاتے۔ یا اس کے جواب سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس سے پوچھا گیا۔ جو روپیہ اس کو امیر حبیب اللہ نے سمت مشرقی میں بھیجا تھا۔ اس کا کیا بنا۔ سپہ سالار طنزاً بولا۔ پہلے سمت مشرقی میں بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ اور اب قندھار آ کر وہی کھیل رچا کھڑا کیا۔ ایسے گولیاں دیں اور بے آبرو کیا۔ آہ! سردار صاحب نے اپنا وعدہ ایفا کر دیا۔ لیکن قندھار اس کا اپنا وطن اسے پناہ نہ دے سکا۔

شہر میں منادی ہوئی۔ دوکانیں کھل گئیں۔ اہالی قندھار کو امان مل چکی تھی رات شہر چراغاں ہوا۔

باب آخر اور میری مراجعت وطن

۱۹ جون ۱۹۲۹ء دن کے دس بجے تک میں شہر قندھار میں رہا۔ گزشتہ ہفتہ عرصہ میں شہر میں کوئی شورش برپا اور بد امنی رونما نہ ہونے پائی۔ کابلی سپاہ کے افراد نے کسی فرد واحد کو کسی قسم کا گزند اور نقصان نہ پہنچایا۔ عوام میں سے کوئی بھی تشدد کا شکار نہ ہوا۔ دوکاندار پیسہ لیتے اور مال کابلی سپاہی کو دیتے۔ ایک روز ملازم بازار شاہ سے پینے کا ٹھنڈا پانی لینے گیا۔ خلاف معمول دیر سے واپس آیا۔ دیر کی وجہ بتائی۔

ایک کابلی سپاہی نے ملازم سے پُرانی صراحی خرید لی تھی۔ اور ملازم کو اس کے عوض نئی صراحی کے پیسے دے دیئے تھے۔ کابلی کو معلوم نہ تھا۔ کہ صراحی کہاں بکتی تھی۔ وہ اجنبی تھا۔ کابلی اگر چاہتا۔ تو صراحی بزور چھین سکتا تھا۔ سُنا کہ عبدالشکور خان قاضی القضاۃ کا ذاتی مال و متاع ضبط کر لیا گیا۔ کیونکہ اس کی ہمدردی امان اللہ خان سے تھی۔ اور اس کے فتوے حبیب اللہ کے خلاف۔ فتح قندھار کے ایک ہفتہ کے اندر ہی امیر حبیب اللہ کا چھوٹا بھائی حمید اللہ اور اس کا باپ قندھار آئے۔ دو تین روز رہ کر واپس کابل چلے گئے۔ میں نے باپ کو بازار شاہ میں دیکھا۔ اس کی عمر اس وقت کوئی ستر سال کی ہو گی۔ پرانی وضع قطع کے عام لٹھہ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ کمر کے گرد سرخ ملتانی دوپٹہ کس رکھا تھا۔ کمر جھکا کر چلتا تھا۔ اکیلا پیادہ جا رہا تھا۔ شاید ایک دو سپاہی اس کے ہمراہ تھے۔ ایک دن کوتوالی میں میرے ساتھ کی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کوتوال احترام بجا لائے بغیر اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ کوتوال سے بولا۔ عورتوں کو جو نماز جمعہ کے لئے مساجد میں جاتی ہیں۔ ان کو روکو۔ وہاں نہ جائیں۔

فتح قندھار کے بعد نئی حکومت نے ملازمین سرکاری اور اکابرین شہر کو دوپہر کا کھانا دیا۔ عام دربار ہُوا دربار سلام خانہ ارگ میں ہُوا۔ نئی حکومت کی طرف سے ایک سادہ لباس پوش اور معقول وضع کے آدمی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے تقریر کی جس کا ماحاصل تھا۔ امیر حبیب اللہ کو ملک گیری کا لالچ اور امیر بننے کا طمع نہ تھا۔ اسے محض دین کی خدمت مطلوب تھی۔ یہ بھی ایک جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ جو اس نے کیا تھا۔ ملک میں بے دینی بڑھ رہی تھی۔ اس کے سدِ باب کے لئے ضروری تھا۔ کہ کوئی خدا کا بندہ باہر نکلتا۔ اس کام کے لئے اللہ نے حبیب اللہ کو چُنا۔ امیر کا ہرگز یہ منشا نہیں۔ کہ

وہ قندھار پر اپنی حکومت جمائے رکھے۔ یہ لوگ بھی محض چند روز کے لئے اُن کے مہمان تھے۔ اور اس کے بعد وہ چلے جائیں گے۔ قندھار کا انتظام خود قندھاری جائیوں ہی نے کرنا تھا۔ وہ خدا ذکرے نہ روسی ہی تھے اور نہ انگریز ان کے اپنے وطن عزیز کے بھائی بند تھے۔ الحمد للہ بے دینی اور بے حیائی کا استیصال ہوا۔ دعا کریں اللہ کا دین پھلے پھولے۔ اور اُن کو اس کی خدمت کی توفیق دے۔ آمین! ۔ وما علینا الا البلاغ المبین کرسئ صدارت پر کابل سے تازہ نودارد امیر حبیب اللہ کا خصوصی نمائندہ پادر صاحب تھا۔ اب سردست حکومت کا نظم ونسق غالباً اس کے ہاتھ میں تھا۔

حاضرین نے وفاداری کا اظہار کیا۔ جواب میں عبدالرؤف خاں نے اکابرین قندھار کی طرف سے ایک مختصر سا کلام کیا۔ پھر سلام خانہ کے فرش پر تھالیوں میں صرف سادہ پلاؤ برتا گیا۔ بالکل سادہ اور بے تکلف کھانا تھا۔ سب نے ہاتھ سے کھایا۔ اور مشترکہ پلیٹ سے۔ ہر تھالی پر دو تین آدمی بیٹھے کھا رہے تھے۔ پانی بھی مشترکہ گلاس سے پیا۔ اس کے بعد لوگ رخصت ہو گئے۔ میرا ذاتی کیس شفاخانہ کے منشی نے بے موقع اسی جگہ پادر صاحب کے روبرو پیش کیا۔ پادر صاحب نے فیصلہ دیا۔ کہ بقایا پندرہ روز کی تنخواہ مجھے واپس خزانہ میں داخل کرنی ہو گی۔ اور اس کے بعد مجھے ہمیشہ کے لئے رخصت تھی۔ میرے لئے مزید کام نہ تھا۔ میں اپنے وطنِ عزیز واپس جا سکتا تھا۔ میں نے غزنی کی مہم میں شامل ہوتے وقت تین ماہ کی تنخواہ حاصل کی تھی۔ ڈھائی ماہ گزر چکے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے زین اور لگام اور خیمہ کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی یہ سامان میں قلات سے فراری کے وقت وہاں اپنے نجی سامان کے ساتھ ہی شفاخانہ کے عملہ کے سپرد کر آیا تھا۔ زین دار قبضہ تو خر کار کے پاس ہی رہتا تھا۔ البتہ خیمہ شب و روز میرا ساتھ دیتا تھا۔

چون و چرا کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے اپنی قرار داد اور نظامنامہ کی طرف اشارہ کیا۔ نظام نامہ کے نام پر یاور صاحب چڑ ہی تو گیا۔ کہنے لگا اس نظامنامہ کی جڑ نکالنے کے لئے ہی تو ہم اُٹھے تھے۔ مزید خفگی مول لینے کا یارا نہ تھا۔ قہر درویش بر جان درویش۔ لبوں پر مہر لگائے واپس باہر ہوائیں آگیا۔ لبعد ازاں یہی یاور صاحب مجھ سے کچھ بے تکلف ہوگیا۔ اسی بے تکلفی میں مجھ سے ایک دن اعلےٰ حضرت امان اللہ خان کے خاندان کے متعلق بیہودہ سوال کرنے لگا۔ جو مجھے ناگوار گزرا۔ بہر حال خندہ پیشانی سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر ایک دن اس نے مجھے خوشی میں خطِ راہداری دیا۔ تحریر تھا۔ "مجھے راستہ میں ہر قسم کی سہولت پہنچائی جائے" وہ میرے کام آیا۔

اب میں سواری کی تلاش میں لگ گیا۔ جو مجھے چمن پہنچا دیتی۔ راستہ مخدوش تھا۔ اور سواری مفقود۔ ایک شام میرے پاس ایک نوجوان لڑکا آیا۔ بولا وہ ایک ڈرائیور ہے۔ اور اپنی کار واپس چمن لے جا رہا ہے۔ اور مجھے چمن پہنچا سکتا ہے۔ میں نے غنیمت جانا۔ صاحب غرض دیوانہ، حسب ہدائت اگلے روز اپنا سامان مقررہ سرائے میں جو شہر سے باہر تھی۔ لے جا کر وہاں بیٹھ گیا۔ وجہ یہ بیان کی۔ کہ یہ کام خفیہ طور پر ہوگا۔ کیونکہ حکومت گاڑیاں بیگار میں پکڑ رہی تھی۔ کوتاہ اندیشی میں مَیں نے کبھی یہ نہ سوچا۔ کہ وہ کس طرح چوری میں جا سکتا تھا۔ جبکہ راستہ میں کئی چوکیوں پر چیک اپنگ ہوگا۔ مثلاً تختہ پُل پر۔ پھر قلعہ جدید پر۔ اُس صورت میں اگر گاڑی رک گئی۔ تو میرا حشر کیا ہوگا۔ بہر حال اندھا بن کر میں گاڑی کی انتظار میں لگ گیا۔ لیکن کار نہ آئی۔ اور نہ آنی تھی۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ انتظار کی گھڑیاں ایک زحمت بن کر رہ گئیں۔ اور حقیقتاً یہ زحمت کی گھڑیاں تھیں۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے اب کیا کرنا تھا۔ اتنے میں ایک کابلی کیپر اردلی

دیر بعد وہ رحمت کو فرشتہ دو تین سپاہیوں سمیت سرائے میں آنکلا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ سرائے
میں کوئی موٹر نہیں آئی اور جب اس نے میرا سامان ایک کمرہ میں تیار ہوا دیکھا۔ تو میرے سر پر
ہو گیا۔ تو ابھی بتاؤ کہ کار کہاں ہے۔ ہر چند میں نے سمجھایا۔ کہ مجھے علم نہیں۔ وہ خود ایک ڈرائیور
کے ذریعہ میں آیا تھا ہوا۔ وہ صبح سے اس کے انتظار میں شہر کے کھوٹ پر رہا ہوں۔ لیکن
سب کچھ بے اثر گیا۔ وہ تو حقیقۃ گھر ا تھا۔ معلوم ہوا یہ گھبرا اور اس شہر کے کوتوال کا خاص
آدمی تھا۔ اور بے گناہ کے موٹروں کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ میں نے کہا بھائی پہچان تو سہی۔
اگر ایسا کرنے والے ہوتے۔ تو امان اللہ خان کو کون کھٹکتا۔ مجھے لاجواب کر دیا۔ میں
اب ڈر سے کانپ گیا۔ سمجھ گیا کہ آج بے آبروئی سے چارہ نہیں۔ اگر یہ سامان اٹھوا کر لے گیا
تو بڑی مصیبت ہو گی۔ یہ تو خیر ہوئی کہ اتفاق سے اور میری خوش قسمتی سے کار کا ڈرائیور یعنی
اس کا مالک عین اس وقت وہاں آنکلا۔ اور جب اس نے دیکھا یہاں آفت برپا تھی۔ تو وہ
جلدی میں کھسکنے لگا۔ میرے منہ سے وہیں نکلا۔ یہ تو کار کا مالک تو آگیا۔ اب یہ جانے
اور آپ۔ اس طرح میری گلوخلاصی ہوئی۔ یہ پارٹی دروازہ سے باہر ہوئی۔ اور میں نے
جلدی جلدی سامان وہاں سے اٹھوایا اور نزدیک ایک ہندو سندانی کی دوکان میں چھپا بیٹھا۔
اور وہاں سے اس وقت نکلا جب رات کافی اندھیری ہو گئی تھی۔ جب بھی کوئی منشا وردی
سپاہی ادھر سے گزرتا۔ اور میں دروازہ سے دیکھ لیتا۔ تو میرے حواس گم ہو جاتے۔

ایک دو دن گھر سے باہر نہ نکلا۔ ایک شام ایک شخص لمبا سا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا
چین چلوگے۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ یہ ایک لاری کا مالک تھا۔ اور چین سے آیا تھا۔ اس بار
کے سامان اور آدمی کا کرایہ طے کر لیا۔ ... صبح سامان لے کر فلاں جگہ پہنچ جانا
اس کے پاس آ ... اگلے روز صبح ... قسمت ...

مقررہ جگہ پہنچ گیا۔ میرا ملازم میرے ساتھ تھا۔ سورج نکل آیا۔ پھر سورج اونچا ہوگیا۔ لیکن لاری
غیر حاضر ہی رہی۔ سمجھا کہ اب گزشتہ ڈرامہ کا بقایا سین ہونے والا ہے۔ خدا خدا کر کے لاری
آئی۔ اس میں سامان رکھوا دیا۔ پھر دوسرا مسافر آیا۔ پھر تیسرا۔ دیکھتے دیکھتے لاری مسافروں سے
بھر گئی۔ حالانکہ سالم گاڑی کا کرایہ مجھ سے حاصل کیا جا چکا تھا۔ دن کے دس بج گئے۔ اور
گاڑی اپنی جگہ پر ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔ لیکن مجھے تشویش نہ تھی۔ مار گزیدہ از ریسمان می ترسد والا
معاملہ تھا۔ خیر کچھ اطمینان تو تھا۔ کہ میں آج اکیلا نہ تھا۔ اتنے میں پاس والی مسجد سے لاری
کے دیگر معزز کرایہ وصول کرنے والے مالک نکلتے نظر آئے۔ کچھ اطمینان ہوا۔ معلوم ہوا۔ کہ آپ
نماز اشراق میں مصروف تھے۔ خوشی ہوئی کہ ایک نیک بندہ سے واسطہ پڑا تھا۔ خود
آپ سفر کی خیریت کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ گاڑی ایک دو روز پہلے
نصف راہ سے واپس ہو گئی تھی۔ کیونکہ راستہ ڈاکوؤں نے روک رکھا تھا۔ ایک مسافر کے
پاؤں میں گولی بھی لگ گئی تھی۔ سوچنے لگا اب کیا ہوگا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان صاحب
کو حکومت قندھار کی طرف سے خلعت بھی ملی تھی۔ کیونکہ حکومت کی خواہش تھی۔ کہ چمن اور
قندھار کے درمیان جلدی سے جلدی آمد و رفت کا سلسلہ بحال ہو جائے۔ جو لاری والا
چمن سے آتا۔ اس کو خلعت سے نوازا جاتا۔ چمن جا کر معلوم ہوا کہ مالک ڈیرہ اسماعیل خان کا
رہنے والا تھا۔ اور حکومت انگریزی کا جاسوس۔ اس کا قندھار آنے کا مطلب اب عیاں تھا۔
یک پنتھ دو کاج۔ ہم خرما ہم ثواب۔ "نالے موج کو شتے نالے دیوی دے درشن"۔ آپ
خدا کے فضل سے دونوں طرف سے خلعت کے حقدار تھے۔ نماز کا یہ عالم کہ نماز اشراق بھی
نہ چھٹتی!۔

خدا خدا کر کے گاڑی چلی اور تختہ پل پر رکی۔ چیک تال کے بعد پھر چل پڑی۔ اور ہم بہت

ملبدی ث شک کی تنگ گھاٹی میں پہنچ گئے۔ مالک نے اشارہ کیا۔ کہ پچھلی بار گاڑی یہیں رُک گئی تھی۔ مجھ سے میرے ملازم نے اس کا ذکر کیا تھا۔ میرا ملازم میرے ساتھ تھا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دریافت کیا۔ کیا ث شک یہی جگہ ہے۔ ڈرائیور بولا۔ آپ کے پاس ضرور بہت سا روپیہ ہوگا۔ تبھی متفکر ہو۔ میں نے جواب دیا اللہ کا فضل ہے۔ کمی کیوں ہونے لگی تھی۔ وہ میرے انکار کا منتظر تھا۔ میرا جواب سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ شکل وصورت میں کچھ اچھا انسان معلوم نہ دیتا تھا۔ میں اکیلا نہ تھا۔ اور پھر تختہ پُل سے دو محافظ کابلی سپاہی بطور بدرقہ ہماری لاری میں بیٹھ گئے تھے۔ ان کے پاس عمدہ رائفل تھیں اور پیٹیاں کارتوسوں سے لدی ہوئی۔ میرا حوصلہ بلند تھا۔ اور اللہ کا کرم وفضل شامل حال تھا۔ دو گارڈ گیا تھے دو فرشتے تھے نگہبان

آج ۱۹ رجون عاشورہ کا دن بھی تھا۔ عجیب نہیں۔ اگر ڈاکو بھی اس دن کا احترام کرتے ہوں۔

بہرحال سفر خیریت سے کٹ گیا۔ اور بغیر کسی کھٹ پٹ اور ٹِک ٹِک کے ہم قلعہ جدید پہنچ چکے تھے۔

یہاں یہ دو کابلی محافظ اتر گئے۔ سامان اور راہداری کی پڑتال ہوئی اور ہم سب پھر چمن کی طرف چل پڑے۔ ۱۹ رجون کے دن شام کے قریب چمن کی پولیس چوکی پر ٹھہر گئے۔ یہاں ہم سب اُتر گئے لاری کا مالک اب ایک مسلمان سرکاری کاردار سے باتوں میں لگ گیا۔ پھر یک بیک میری طرف مخاطب ہوا۔ بولا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ملازم کا کرایہ ادا کرو۔ میں نے کہا بھائی۔ اونٹ نہ گھوڑے پورے سالم لاری کا کرایہ وصول کیا۔ اب یہ ستم ظریفی کہ ملازم کا کرایہ مانگ رہے ہو۔ کچھ تو خدا کا خوف کھاؤ۔ حق تو مجھے پہنچتا تھا۔ کہ اعتراض کرتا۔ میرے انکار پر وہ میرا سارا سامان اپنے ہمراہ لے گیا۔ اور میں متوقع تھا۔ کہ ایڈ وارڈ داڑھی والے سرکاری کارکن انصاف کا ساتھ دیں گے۔ میرے خیال میں لاری کے ڈرائیور اور اشراقی نمازی لاری والے کے درمیان کچھ سازباز ہو چکی تھی۔ اور میرا کچھ سامان اُڑانا چاہتے تھے۔ اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے تھے۔

میرا میزبان مرزا غلام حیدر خود ہماری لاری تک آ کر میرا سامان لاری والے سے لے آیا تھا۔ اشراقی نمازی
نے میری ٹوپی اور کوٹ اور جیب گھڑی اڑا لی تھی۔ غالباً یہ مالک نماز غریب کاری کے لئے پڑھتا تھا۔
تب میں نے قاضی صاحب سے جو شہر بدر الاماری کا افسر تھا۔ گلہ کیا۔ تو وہ بولا میاں جانے دو۔ یہ
نمازی ہے بہت کام آتا ہے۔ میں نے کہا تو کیا اس کی اجرت میں نے ادا کرنی تھی۔ خیر بات آئی
گئی ہو گئی۔ پھر قاضی صاحب نے مجھے مجبور کیا۔ کہ میں اپنے ملازم عبدل کو واپس قندھار بھیج دوں۔ کہنے
لگا۔ چونکہ اس میں قانونی پیچیدگیاں ہیں۔ میرے لئے دوسرا راستہ نہ تھا۔

رات مرزا غلام حیدر کے ہاں گزار کر اگلے دن کوئٹہ کی راہ لی۔ اور اس سے اگلے دن خیر و
خوبی اپنے وطن امرتسر میں شام کے وقت پہنچ گیا۔

وَھُوَ رَحِیمٌ کَرِیمٌ۔ ولہُ الحمد

انڈین ایمپائر کا پاسپورٹ نمبر 8925 بطور یادگار اب بھی میرے
قبضہ میں ہے۔ اور اس پر آخری دستخط عبدالعزیز فرنٹیئر کسٹم اینڈ پاسپورٹ
افسر کے ہیں۔ تاریخ ۱۹/۲۰ جون ثبت ہے۔ 1929ء

(کتبہ ستار جنگوی)